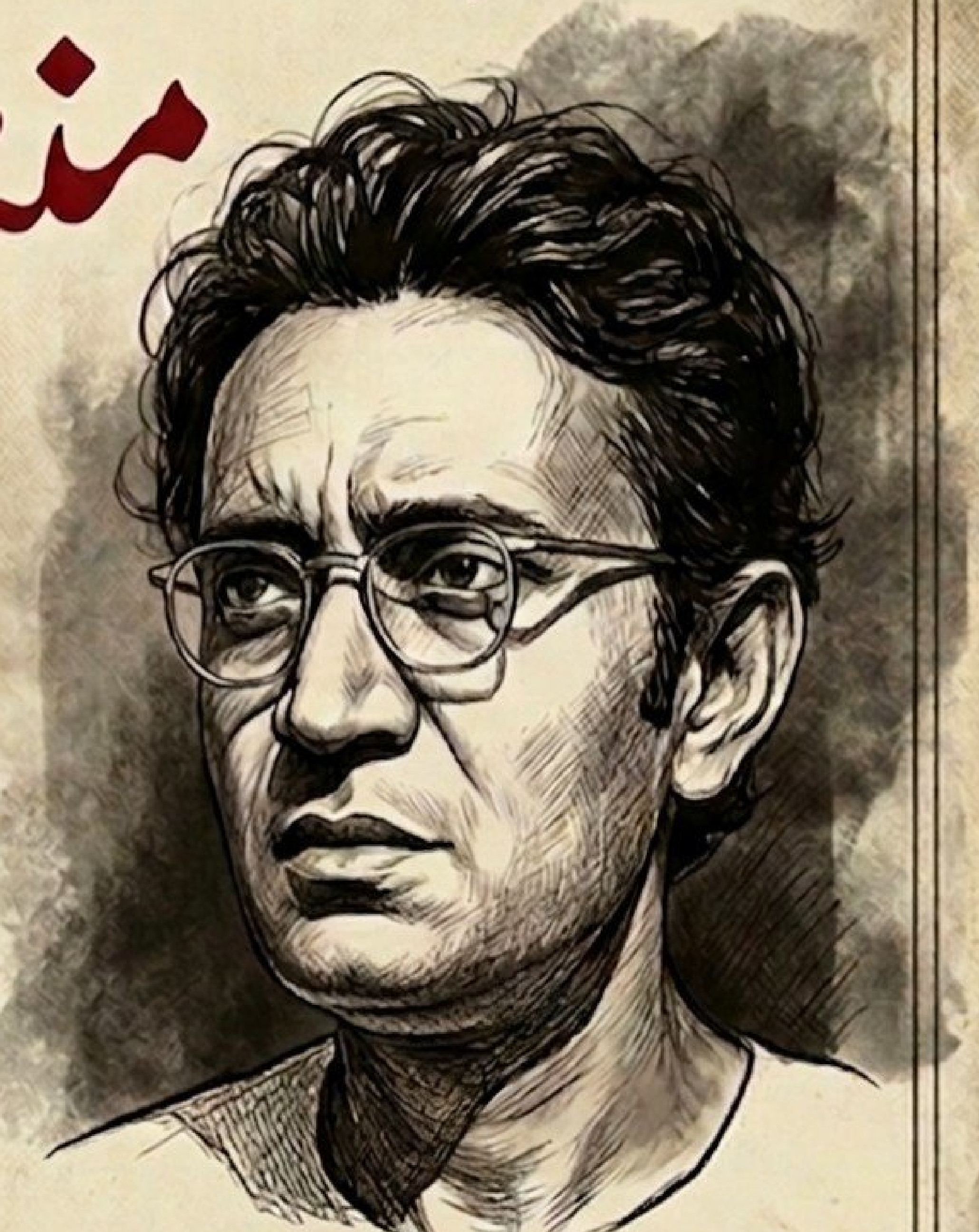
حقیقتِ حقیقی کا روحِ رواں

منٹو



انتخاب و ترتیب: ڈاکٹر محمد زمان پرویز

بسم الله الرحمن الرحيم

حقیقتِ حقیقی کا روحِ رواں منٹو

(باندازِ نوع)

انتخاب و ترتیب

ڈاکٹر محمد زمان پرویزؔ

لائل پور پبلشرز

فیصل آباد

ضابطہ

سرنامہ : حقیقتِ حقیقی کا روحِ رواں منٹو (بااندازِ نوع)

معروض : ترتیب وانتخاب

نوامند : ڈاکٹر محمد زمان پرویزؔ

تزئین : محمد شایان خان

03369759678

سرورق : ولی گرافکس

تعداد کتب : پانچ سو

موسمِ اشاعت : دو ہزار چھبیس

زرِمبادلہ : 1000 روپے

زیرِاہتمام : لائل پور پبلشرز

انتساب

سعادت حسن منٹو

کے نام

فہرست

حقیقتِ حقیقی کا روحِ رواں منٹو (باانداز نوع)

منٹو حقیقت ِحقیقی کے متلاشی رہے اور منٹو نے ساری زندگی جرات مندانہ طور پر معاشرتی حقیقت نگاری کہانیوں کی عکاسی کی جو حقیقتِ حقیقی سے پردہ کو ہٹاتی ہے اور جنسیات کو بے نقاب کرتی ہے۔ منٹو کے چھ افسانے جن میں ٹھنڈا گوشت، کھول دو، بو، دھواں، اوپر نیچے اور درمیان پر فحاشی کے الزام کے تحت فوجداری مقدمات درج کر کے چلائے گئے اور منٹو کو کئی بار جیل کی ہوا کھانا پڑی۔ سب سے پہلے منٹو پر مقدمات برطانوی حکومت نے چلائے۔ افسوس تب ہوا جب اس وقت کی حکومت ِپاکستان نے منٹو پر مقدمات چلائے۔ امروز جب نظر ادبی دنیا پر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ منٹو کے افسانوں کا سہارا لے کر ہمارے نقاد حقیقتِ حقیقی کو بیان کرتے ہیں۔ چند متن ملاحظہ ہوں:

وہ کئی دن سے شدید قسم کی تنہائی سے اُکتا گیا تھا۔ جنگ کے باعث بمبئی کی تقریباً تمام کرسچین چھوکریاں جو سستے داموں مل جایا کرتی تھیں عورتوں کی انگریزی فوج میں بھرتی ہوگئی تھیں، ان میں سے کئی ایک نے فورٹ کے علاقے میں ڈانس اسکول کھول لیے تھے جہاں صرف فوجی گوروں کو جانے کی اجازت تھی۔ رندھیر بہت اداس ہوگیا تھا۔ اس کی انا کا سبب تو یہ تھا کہ کرسچین چھوکریاں نایاب ہوگئی تھیں اور دوسرا یہ کہ فوجی گوروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مہذب، تعلیم یافتہ اور خوبصورت نوجوان اس پر فورٹ کے لگ بھگ تمام کلبوں کے دروازے بند کر دیے تھے۔

اس کی چمڑی سفید نہیں تھی۔ جنگ سے پہلے رندھیر ناگپاڑہ اور تاج محل ہوٹل کی کئی مشہور و

معروف کرسچین لڑکیوں سے جسمانی تعلقات قائم کر چکا تھا۔ اسے بخوبی علم تھا کہ اس قسم کے تعلقات کی کرسچین لڑکوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ معلومات رکھتا تھا جن سے یہ چھوکریاں عام طور پر رومانس لڑاتی ہیں اور بعد میں کسی بیوقوف سے شادی کر لیتی ہیں۔ رندھیر نے بس یوں ہی ہیجل سے بدلہ لینے کی خاطر اس گھاٹن لڑکی کو اشارے پر بلایا تھا۔

ہیجل اس کے فلیٹ کے نیچے رہتی تھی اور ہر روز صبح وردی پہن کر کٹے ہوئے بالوں پر خاکی رنگ کی ٹوپی ترچھے زاویئے سے جما کر باہر نکلتی تھی اور لڑکپن سے چلتی تھی جیسے فٹ پاتھ پر چلنے والے سبھی لوگ ٹاٹ کی طرح اس کے راستے میں بچھے چلے جائیں گے۔ رندھیر سوچتا تھا کہ آخر کیوں وہ ان کرسچین چھوکریوں کی طرف اتنا زیادہ مائل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے جسم کی تمام دکھائی جاسکنے والی اشیا کو نمائش کرتی ہیں۔

کسی قسم کی جھجک محسوس کیے بغیر اپنے کارناموں کا ذکر کر دیتی ہیں۔ اپنے بیتے پرانے رومانسوں کا حال سُنا دیتی ہیں۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن کسی دوسری لڑکی میں بھی تو یہ خاصیتیں ہوسکتی ہیں۔ رندھیر نے جب گھاٹن لڑکی کو اشارے سے اوپر بُلایا تو اسے کسی طرح بھی اس بات کا یقین نہیں تھا کہ وہ اسے اپنے ساتھ سُلا لے گا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد اس نے اس کے بھیگے ہوئے کپڑے دیکھ کر یہ سوچا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بیچاری کو نمونیا ہو جائے تو رندھیر نے اس سے کہا تھا۔

"یہ کپڑے اُتار دو۔ سردی لگ جائے گی۔"

وہ رندھیر کی اس بات کا مطلب سمجھ گئی تھی کیوں کہ اس کی آنکھوں میں شرم کے لال ڈورے تیر گئے تھے لیکن بعد میں جب رندھیر نے اسے اپنی دھوتی نکال کر دی تو اس نے کچھ دیر سوچ کر اپنا لہنگا اتار دیا۔ جس پر میل بھیگنے کی وجہ سے اور بھی نمایاں ہو گیا تھا۔ لہنگا اتار کر اس

نے ایک طرف رکھ دیا اور جلدی سے دھوتی اپنی رانوں پر ڈال لی۔ پھر اس نے اپنی تنگ بھنچی بھنچی چولی اتارنے کی کوشش کی جس کے دونوں کناروں کو ملا کر اس نے ایک گانٹھ دے رکھی تھی۔ وہ گانٹھ اس کے تندرست سینے کے ننھے لیکن سمٹیلے گڑھے میں چھپ گئی تھی۔ دیر تک وہ اپنے گھسے ہوئے ناخنوں کی مدد سے چولی کی گانٹھ کھولنے کی کوشش کرتی رہی جو بھیگنے کی وجہ سے بہت زیادہ مضبوط ہوگئی تھی۔ جب تھک ہار کر بیٹھ گئی تو اس نے مراٹھی زبان میں رندھیر سے کچھ کہا جس کا مطلب یہ تھا۔

"میں کیا کروں۔ نہیں نکلتی۔"

رندھیر اس کے پاس بیٹھ گیا اور گانٹھ کھولنے لگا۔ جب نہیں کھلی تو اس نے چولی کے دونوں سروں کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اس زور سے جھٹکا دیا کہ گانٹھ سراسر پھیل گئی اور اس کے ساتھ ہی دو دھڑکتی ہوئی چھاتیاں ایک دم سے نمایاں ہوگئیں۔ لمحہ بھر کے لیے رندھیر نے سوچا کہ اس کے اپنے ہاتھوں نے اس گھاٹن لڑکی کے سینے پر، نرم نرم گندھی ہُوئی مٹی کو ماہر کمھار کی طرح دو پیالوں کی شکل بنا دی ہے۔ اس کی صحت مند چھاتیوں میں وہی گدگداہٹ، وہی دھڑکن، وہی گولائی، وہی گرم گرم ٹھنڈک تھی جو کمھار کے ہاتھوں سے نکلے ہوئے تازہ برتنوں میں ہوتی ہے۔

مٹمیلے رنگ کی جوان چھاتیوں میں جو بالکل کنواری تھیں۔ ایک عجیب و غریب قسم کی چمک پیدا کر دی تھی جو چمک ہوتے ہُوئے بھی چمک نہیں تھی۔ اس کے سینے پر یہ ایسے دیے معلوم ہوتے تھے جو تالاب کے گدلے پانی پر جل رہے تھے۔ برسات کے یہی دن تھے۔ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے اسی طرح کپکپا رہے تھے۔ لڑکی کے دونوں کپڑے جو پانی میں شرابور ہو چکے تھے ایک گدلے ڈھیر کی صورت میں پڑے تھے اور وہ رندھیر کے ساتھ

چپٹی ہوئی تھی۔

اس کے ننگے بدن کی گرمی اس کے جسم میں ایسی ہلچل سی پیدا کر رہی تھی جو سخت جاڑے کے دنوں میں نائیوں کے گرم حماموں میں نہاتے وقت محسوس ہوا کرتی ہے۔ دن بھر وہ رندھیر کے ساتھ چپٹی رہی۔ دونوں جیسے ایک دوسرے کے مدغم ہو گئے تھے۔ انھوں نے بہ مشکل ایک دو باتیں کی ہوں گی۔ کیوں کہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا سانسوں، ہونٹوں اور ہاتھوں سے طے ہو رہا تھا۔ رندھیر کے ہاتھ ساری کی چھاتیوں پر ہوا کے جھونکوں کی طرح پھرتے رہے۔ چھوٹی چھوٹی چوچیاں اور موٹے موٹے گول دانے جو چاروں طرف ایک سیاہ دائرے کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے ہوائی جھونکوں سے جاگ اٹھتے اور اس گھاٹن لڑکی کے پورے بدن میں ایک سرسراہٹ پیدا ہو جاتی کہ خود رندھیر بھی کپکپا اٹھتا۔

ایسی کپکپاہٹوں سے رندھیر کا سینکڑوں بار واسطہ پڑ چکا تھا۔ وہ ان کو بخوبی جانتا تھا۔ کئی لڑکیوں کے نرم و نازک اور سخت سینوں سے اپنا سینہ ملا کر کئی کئی راتیں گزار چکا تھا۔ وہ ایسی لڑکیوں کے ساتھ بھی رہ چکا تھا جو بالکل اس کے ساتھ لپٹ کر گھر کی وہ ساری باتیں سُنا دیا کرتی تھیں جو کسی غیر کے لیے نہیں ہوتیں۔ وہ ایسی لڑکیوں سے بھی جسمانی تعلق قائم کر چکا تھا جو ساری محنت کرتی تھیں اور اسے کوئی تکلیف نہیں دیتی تھیں۔

لیکن یہ گھاٹن لڑکی جو پیڑ کے نیچے بھیگی ہُوئی کھڑی تھی اور جسے اس نے اشارے سے اوپر بلا لیا تھا مختلف قسم کی لڑکی تھی۔ ساری رات رندھیر کو اس کے جسم سے ایک عجیب قسم کی بُو آتی رہی تھی۔ اس بُو کو جو بیک وقت خوشبو بھی تھی اور بد بُو بھی۔ وہ ساری رات پیتا رہا۔ اس کی بغلوں سے، اس کی چھاتیوں سے، اس کے بالوں سے، اس کے پیٹ سے، جسم کے ہر حصّے سے یہ جو بد بُو بھی تھی اور خوشبو بھی، رندھیر کے پورے سراپا میں بس گئی تھی۔

ساری رات وہ سوچتا رہا تھا کہ یہ گھاٹن لڑکی بالکل قریب ہونے پر بھی ہرگز اتنی قریب نہ ہوتی اگر اس کے جسم سے یہ بُو نہ اُڑتی۔ یہ بو اس کے دل و دماغ کی ہر سلوٹ میں رینگ رہی تھی۔ اس کے تمام نئے پرانے محسوسات میں رچ گئی تھی۔ اس بُو نے اس لڑکی اور رندھیر کو جیسے ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر دیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے تھے۔ ان بیکراں گہرائیوں میں اُتر گئے تھے جہاں پہنچ کر انسان ایک خالص انسانی تسکین سے محظوظ ہوتا ہے۔

المختصر میرے نقطہ نظر سے یہ بات ثابت ہوئی کہ منٹو نے انسانی ذہن کے تحتِ الشعور سے ہوتے ہوئے لا شعور میں اس حقیقت کو اجاگر کیا جہاں عام انسان کی پہنچ نہیں تھی۔ منٹو مستقبل پر گہری نظر رکھتے تھے۔ منٹو یہ اپنے دورِ حاضر کی ضرور عکاسی کی ہو گی لیکن میری نظر میں آج منٹو کے افسانے پڑھیں تو ایسا لگتا ہے منٹو زندہ ہے اور آج سب کچھ اپنی دیدہ بینا نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ منٹو کے یہ افسانے آج اس المیہ کا رونا روتے ہیں جو صرف میں نہیں کہتا بلکہ کیا کسی شاعر نے خوب کہا کہ:

یہ رونا صرف میرا نہیں ہے رونا ہے سارے گلستان کا

میں گل ہوں خزاں گل کی گویا خزاں ہے میری

منٹو ایک ایسا انسان تھا جس نے انسانی ذہن میں پوشیدہ باتوں کو عام فہم زبان میں بیان کر دیا۔ منٹو کو عدالتوں میں پیش ہونا پڑا۔ منٹو نے تمام تر مشکلات کے باوجود حق کی آواز کو بے پردہ نہیں ہونے دیا بلکہ ہمت و جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے منٹو نے وہی آئینہ وقتِ

حکومت کو پیش کیا جو اس معاشرے میں ہو رہا تھا۔ ہر انسان کی بس کی بات نہیں کہ وہ حقیقتِ حقیقي تک رسائی حاصل کر سکے۔ منٹو ایک ایسا انسان تھا جس نے انسانی ذہن کے تحت الشعور سے وہ باتیں عیاں کیں جو ہر لکھاری کے بس کی بات نہیں ہے۔ فحاشی سے چند لوگوں نے اپنی ترقی کو آگے بڑھتا دیکھا پر منٹو نے اس ترقی کو ترقی کا نام نہیں دیا بلکہ صاف آئینہ دکھایا اور بتایا کہ یہ انسان کی توہین ہے اور انگریز سماج کی چال ہے کہ مسلمانوں کو فحاشی میں مبتلا کر کے اسے اس قدر تباہ کر دیا جائے کہ وہ اس نشے سے باہر نہ نکل سکیں اور اس میں اپنی چاندنی کو روشن رکھیں۔

منٹو سب کچھ اپنی آنکھ کی پتلی سے دیکھ رہا تھا اور اس نے انسانی تباہی اس فحاشی میں دیکھ لی تھی۔ اس لیے منٹو کو اس فحاشی میں انسان کے زرد اور کھوکھلے جسم نظر آ رہے تھے۔ ایک شاعر نے کیا خوب کہا کہ:

لوگ کہتے ہیں کہ ہوا ہی کیا ہے
مجھ کو اس بات کا دکھ ہے کہ بچا ہی کیا ہے
خون تک چوس لیا عہدِ خزاں نے یارو
زرد اور کھوکھلے جسموں میں رہا ہی کیا ہے

(ڈاکٹر محمد زمان پرویز)

جنس کی جمالیات اور منٹو

منٹو جنسی عمل کے فلسفیانہ حقیقت اور اس کے جمال و جلال سے واقف تھے اسی لیے انہوں نے اپنے افسانوں میں جنس کو موضوع بنایا اور سیکس کی اصل روح کو پیش کیا لیکن زیادہ تر نقادوں نے ان کے اسلوب کی نفاست اور لطافت کو سمجھے بغیر ان پر فحش نگاری کا الزام عاید کر دیا۔ یہاں تک کہ ان پر مقدمے بھی چلائے گئے اور انہیں صفائی دیتے ہوئے یہ کہنا پڑا:

''عورت اور مرد کا رشتہ فحش نہیں ہے۔ان کا ذکر بھی فحش نہیں۔لیکن جب اس رشتے کو چوراسی آسنوں یا جوڑ دار خفیہ تصویروں میں تبدیل کر دیا جاجائے اور لوگوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ تخلیے میں اس رشتے کو غلط زاویے سے دیکھیں تو میں اس فعل کو صرف فحش ہی نہیں بلکہ نہایت گھناونا،مکروہ اور غیر صحت مند کہوں گا۔''

جنس کے متعلق منٹو کے بیانات کی تقویت D.H.Lawrence کے اس خیال سے بھی ہو جاتی ہے:

''جنس اور حسن ایک ہی چیز ہے۔شعلہ اور آگ کی طرح۔اگر تم جنس سے نفرت کرتے ہو تو تم حسن سے بھی نفرت کرتے ہو۔اگر تم زندہ حسن سے پیار کر سکتے ہو اور جنس سے نفرت،لیکن حسن سے پیار کرنے کے لیے جنس کا احترام لازمی ہے۔جنس اور حسن نا قابل تقسیم ہیں۔جیسے زندگی اور شعور جو ذہانت جنس اور حسن سے وابستہ ہے اور جنس اور حسن سے جنم لیتی ہے وہی وجدان ہے۔''

یونانی دیومالا کے مطابق کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں ایسے لوگ ہوتے تھے جونصف عورت اورنصف مرد تھے۔نصف عورت اورنصف مرد ہونے کی وجہ سے انہیں اپنے کاملیت پرناز تھا۔اس لیے وہ دیوتاؤں کے خلاف بغاوت کردیتے تھے جس کی وجہ سے دیوتاؤں کے بادشاہ Zeus نے ان کے جسم کے دوالگ الگ ٹکڑے (نصف عورت اورنصف مرد) کرکے زمین پر پھینک دیا۔اس دن سے آج تک عورت اور مرد کے منقسم حصّے ایک دوسرے کے ساتھ ضم ہوکر تکمیل پانے کی کوشش کررہے ہیں۔اسی لیے شکیل الرحمٰن نے اس موضوع پراظہارِخیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ''ہرمرد کے اندرعورت ہے اور ہرعورت کے اندرمرد،یہ دونوں حقیقتیں ایک دوسرے سے اس وقت ملتی ہیں جب یوگ سے انہیں بیدارکیا جاتا ہے''۔

منٹو نے بھی Sexo-Yogic عمل کے لطیف احساسات کواپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔انھوں نے اس موضوع کے لیے جواسلوب وضع کیا ہے اس سے جنسی تلذذ کی نفیس اور لطیف کیفیت پیدا ہوتی ہے۔اس میں تخریبی یادرندگی کے جذبات نہیں ابھرتے ہیں۔منٹو نے اس قسم کے افسانوں میں صرف سیکس کے ان تجربات کوپیش کیا ہے جن سے ہمیں جنسی آسودگی حاصل ہوتی ہے اورجنسی تلذذکی روحانی کیفیت کااحساس ہوتا ہے۔'بلاؤز'،'دھنوا'،'شاردا'،'خوشیا'اور'بُو'وغیرہ افسانوں میں جنسی تلذذ کے مختلف سطحیں ہیں اورتلذذ کی ان کیفیات کے اظہارکے لیے منٹوں نے جواسلوب خلق کیا ہے اس کے بھی کئی (Shades)رنگ نظرآتے ہیں۔مثال ملاحظہ ہو:

''شاردا نے گلاس پکڑ لیا۔تھوڑی دیرتک اس کو عجیب نگاہوں سے دیکھتی رہی،پھر نذیر کی طرف مظلومانہ نگاہوں سے دیکھا۔اورناک انگلیوں سے بند کرکے سارا گلاس غٹا غٹ پی گئی۔

قے آنے کو تھی مگر اس نے روک لی۔ دھوتی کے پلو سے اپنے آنسو پونچھ کے اس نے نذیر سے کہا، ''یہ پہلی اور آخری بار ہے۔''

''لیکن میں نے کیوں پی؟'' نذیر نے اس کے گیلے ہونٹ چومے اور کہا ''یہ مت پوچھو۔'' یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ شام کو سات بجے اس نے دروازہ کھولا۔ کریم آیا تو شاردا نظریں جھکائے باہر چلی گئی۔ کریم بہت خوش تھا۔ اس نے نذیر سے کہا، '' آپ نے کمال کر دیا۔۔ آپ سے سو تو نہیں مانگتا، پچاس دے دیجیے۔''

طوائفوں کے ساتھ جنسی تعلق کے جو Modes ہیں وہ دیگر جنسی تجربوں سے متعلق افسانوں سے بالکل مختلف ہیں۔ مثلاً افسانہ 'ہتک' میں سیکس کا جو Degree of Satisfaction ہے وہ دوسرے نوعیت کی ہے۔ اس افسانہ کے پہلے ہی پیراگراف ''دن بھر تھکی ماندی وہ ابھی ابھی اپنے بستر پر لیٹی تھی اور لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی کا داروغہ صفائی، جسے وہ سیٹھ کے نام سے پکارا کرتی تھی، ابھی ابھی اس کی ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ کر شراب کے نشے میں چور، گھر کو واپس گیا تھا۔۔'' سے معلوم ہوتا ہے کہ منٹو 'کام سوتر' کے اصل جوہر سے واقف ہیں۔ منٹو کے بعض نقادوں نے ''ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ نے'' کی رعایت سے لکھا ہے کہ منٹو نے اس عبارت میں سوگندھی کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا ہے۔ دراصل نقادوں نے اس عبارت کے اسلوب کو سمجھے بغیر یہ رائے دی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مباشرت کے پرم آنند کا احساس اسی وقت ہوتا ہے جب ہڈیاں پسلیاں جھنجھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ مہا کوی کالی داس نے بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انہوں نے ''رگھو ونشم'' میں سیتا اور رام کی شادی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ راجہ 'دس رتھ' اپنی وِشال سینا کے ساتھ بارات لے کر جب جنک نگری پہنچے تو ان کی سینا نے وہاں کے باغوں کے پھولوں اور کھیتوں میں لگے فصلوں کو

روند ڈالا ۔ پھر بھی اس نگری نے سینا کے اس عمل کو ویسے محظوظ کیا جیسے عورتیں اپنے پریتم کے کٹھور سنبھوگ کو محظوظ کرتی ہیں ۔'خوشیا' اور'بُو' میں جنسی آسودگی کی سطح کچھ اور رہی ہے ۔افسانہ 'خوشیا' میں کانتا کے عریاں بدن کو دیکھنے کے بعد خوشیا کے اندر آہستہ آہستہ جنسی خواہش اس طرح بیدار ہونے لگتی ہے جیسے ''کام دیو'' نے'سوتر وان'خوشیا کے سینہ میں پیوست کر دیئے ہوں لیکن اس کے اندر کا مرد اس وقت بیدار ہوتا ہے جب کانتا اس کے سامنے ننگی چلی آتی ہے اور خوشیا کے اعتراض کے بعد کہتی ہے کہ تو کیا ہوا تم اپنا خوشیا ہی تو ہو۔منٹو نے اس خاص لمحے کے بیان کے لیے جو پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے اس کی دو خوبیاں ہیں ۔سیکس کے سوئے ہوئے جذبہ کو گدگدا کر بیدار کرنے کی خوبی اور دوسری خوبی احساسِ'ہتک' ہے جو سیکس کے جذبے کی شدّت میں اضافہ کر دیتا ہے ۔اسی طرح افسانہ'بُو' میں سیکس کی لذت کے اظہار کے لیے جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے وہ منٹو کے جنسی تجربے اور روحانی لذتیت (Eroticism) سے اس طرح ہم آہنگ ہو گیا ہے کہ قاری بھی پرم آنند کی کیفیت سے محظوظ ہونے لگتا ہے ۔اس افسانہ میں گھاٹن لڑکی کے پستانوں کو دیکھنے کے بعد رندھیر کے جسم میں بھی وہی برقی لہر دوڑ جاتی ہے جو کالی داس کی تخلیق ''کمار سمبھو'' میں پاروتی کے سینے سے چادر کھسک جانے کے بعد اس کے پستانوں کو دیکھ کر شیو جی کے ریشے ریشے میں سیکس کی برقی لہر ڈوڑ گئی تھی ۔ رندھیر گھاٹن کے ساتھ صرف ایک رات اپنے کمرے میں رہتا ہے اور ایک ہی رات میں اس نے سیکس کی وہی Altimate لذت حاصل کر لی جو شیو جی نے یوگوں یوگوں تک پاروتی کے ساتھ'ہمالیہ پروت پر حاصل' کی تھی ۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منٹو نے صدیوں سے چلے آرہے ہندوستانی جنسی تقدس کے تصور کو از سرِ نو قاری سے متعارف کرا کر اس عمل کے ان پہلوؤں پر غور کرنے کے لیے امادہ کیا ہے جسے لوگ بھول چکے ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ منٹو پر فحش نگاری

کاالزام لگایا گیا تھا کیوں کہ لوگ جنسی عمل کو فحش عمل سمجھنے لگے تھے۔رندھیر اور گھاٹن لڑکی کے Sexo-Yogic لمحات کے بیان کے لیے منٹو نے جو اسلوب خلق کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیکس کی دیوی ’’مہاناگنی‘‘ نے سیکس کے دیوتا ’مہاناگ‘ کو دبوچ لیا ہے اور آسمان سے جنسی تلذز کے رسوں کی امرت ورشا شروع ہوگئی ہے۔بنجر دھرتی زرخیز ہو رہی ہے، پیڑ پودے سبز و شاداب ہو رہے ہیں۔پھول کھلنے لگے ہیں اور ان کی خوشبوؤں سے عالم مہک اٹھا ہے۔یہ منٹو کے اسلوب کی جادوگری کا کمال ہے۔سیکس کی ایسی کیفیت اور فضا منٹو جیسا فنکار ہی پیدا کرسکتا ہے۔منٹو کے اسلوب سے منٹو کا فن، ان کے تجربے اور روح ہم آہنگ ہوکر جنسی تلذز کو لافانی بنادیا ہے۔منٹو کا کمال یہ ہے کہ مختلف النوع جنسی تجربات واحساسات کے اظہار کے لیے جو پیرایہ بیان اختیار کیا ہے اس میں ان کے اپنے تجربے شامل ہوگئے ہیں اور ان کے قاری بھی ویسا ہی محسوس کرنے لگتے ہیں جیسے ان کے افسانوں کے کرداروں نے محسوس کیا تھا۔ان کے افسانوں کے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے:

’’مسعود کو ای شرارت سوجھی۔دبے پاؤں وہ نیم باز دروازے کی طرف بڑھا اور دھما کے کے ساتھ اس نے دونوں پٹ کھول دیئے۔دو چیخیں بلند ہوئیں اور کلثوم اور اس کی سہیلی بملا نے جو کہ پاس پاس لیٹی تھیں، خوف زدہ ہوکر جھٹ سے لحاف اوڑھ لیا۔۔۔۔بملا کے بلاؤز کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور کلثوم اس کے عریاں سینے کو گھور رہی تھی‘‘(دھواں)

منٹو نے ان عبارتوں میں عورتوں کے سینے کے اُبھار اور گداز کے لمس سے جنسی تلذز کے برقی کیفیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔صنف نازک کی اس حصّے کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سنسکرت کے ایک عظیم شاعر اور مفکر بھرتھری ہری نے لکھا ہے:

’’چھوڑ ان پھیکے باسی اُپدیشوں کو/ مرد کو تو سرف دو چیزوں کی لگن ہونی چاہئے/ بھرپور

چھاتیوں والی اس ناری کی جو کام رس کو اُبھارے/ اور دل کو موہ لینے والی بَن کی۔"

دراصل رقص کا آغاز بَن یعنی جنگل کے معاشرے میں ہوا تھا کیوں کہ جنگل کے معاشرے میں بدن جذبے کے عریاں اور والہانہ اظہار کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔موسیقی سے بھی جنسی جذبہ کا تعلق بہت گہرا ہے۔منٹو کے افسانوں کے چند اقتباسات اور ملاحظہ کیجئے جن میں جنسی کی جمالیات نقطۂ عروج پر ہے۔

"کھڑکی کے پاس باہر پیپل کے پتےّ رات کے دودھیالے اندھیرے میں جھوم روں کی طرح تھرتھرا رہے تھے اور نہا رہے تھے اور وہ گھاٹن لونڈیا رندھیر کے ساتھ کپکپاہٹ بن کر چمٹی ہوئی تھی۔"(بُو)

"رندھیر اس کے پاس بیٹھ گیا اور گانٹھ کھولنے لگا۔جب نہیں کھلی تو تھک ہار کر اس کے ایک ہاتھ میں چولی کا ایک سرا پکڑا، دوسرے ہاتھ میں دوسرا سرا اور زور سے جھٹکا دیا۔گرہ ایک دم پھسلی، رندھیر کے ہاتھ زور سے اِدھر اُدھر ہٹے اور دو دھڑکتی ہوئی چھاتیاں ایک دم نمایاں ہو گئیں۔لمحہ بھر کے لیے رندھیر نے سوچا کہ اس کے اپنے ہاتھوں نے اس گھاٹن لڑکی کے سینے پر نرم نرم گندھی ہوئی مٹّی چابک دست کمہار کی طرح دو پیالوں کی شکل دے دی ہے۔"(بُو)

"اس بو نے اس لڑکی اور رندھیر کو ایک رات کے لئے آپس میں حل کر دیا تھا۔دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے تھے۔ان عمیق ترین گہرائیوں میں اتر گئے تھے، جہاں پہنچ کر انسانی لذت میں تبدیل ہو گئے تھے۔ایسی لذت جو لمحاتی ہونے کے باوجود دائمی تھی۔جو مائل پرواز ہونے کے باوجود ساکن اور جامد تھی۔۔۔دونوں ایک ایسا پنچھی بن گئے تھے جو آسمان کی نلاہٹوں میں مائل پرواز رہنے پر بھی غیر متحرک دکھائی دیتا ہے۔

۔۔۔اس بوکو، جواس گھاٹن لڑکی کے ہرمسام سے پھوٹ رہی تھی، رندھیرا اچھی طرح سمجھتا تھا۔حالانکہ وہ اس کا تجزیہ نہیں کرسکتا تھا۔جس طرح بعض اوقات مٹی پر پانی چھڑ کنے سے سوندھی سوندھی بو نکلتی ہے۔لیکن نہیں، وہ بو کچھ اور ہی طرح کی تھی۔اس میں لونگ اور عطر کا مصنوعی پن نہیں تھا، وہ بالکل اصلی تھی۔۔۔عورت اور مرد کے باہمی تعلقات کی طرح اصلی اور مقدس۔‘‘(بو)

قدیم ہندوستانی فنکاروں نے جنسی عمل کے دوران عورت کے بدن سے نکلنے والی خوشبوؤں کو کبھی مٹّی کی سوندھی خوشبوتو کبھی جنگلی پھولوں اورخوشبودار پتوں کی خوشبو سے تعبیر کیاہے۔جدید ماحولیاتی وجنسیاتی مطالعے کی رو سے دوران مباشرت عورت کے بدن سے نکلنے والی خوشبو سے ماحول کی کثافت دور ہوتی ہے۔منٹو نے بار بار’بُو‘ کا ذکر کر کے شاید حددرجہ آگہی کا ثبوت دیا ہے۔بعض جنسی ماہرین کا خیال ہے کہ مباشرت کے عمل کے دوران مرد کی پسندیدہ خوشبوعورت کے بدن سے نکلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے جو مرد کو اس قدر مدہوش کر دیتی ہے کہ وہ جنسی عمل سے کبھی فارغ نہیں ہونا چاہتا ہے۔شکیل الرحمٰن نے اسی نکتہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

’’حساس فنکاروں کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ ہر عورت کی اپنی خوشبو ہوتی ہے،خوشبو کا رشتہ قائم ہو جائے تو سچی جنسی تسکین حاصل ہوتی ہے۔نیز سچا انبساط ملتا ہے، جو عورتیں جسم پر خوشبوؤں کا استعمال نہیں کرتیں ان کے بدن سے مٹی کی سوندھی سوندھی وہ خوشبو ملتی ہے جو آدم کو حوا سے ملی ہوگی۔ مٹی کی یہ سوندھی خوشبو عورت کے ہر عضو پر ہونٹوں کو رکھ دینے پر مجبور کر دیتی ہے، یہ خوشبو جادو ہے، جہاں ہونٹ رکھئے وہی خوشبو ملے کہ جس سے احساس وشعور کی بے قراری بڑھ جائے اور پھر محسوس ہو جیسے اس خوشبو نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔وہ عورت کہ جس نے

حضرت سلیمان کو چوم کر یہ کہا تھا میرا بستر دارچینی کی خوشبو سے معطر ہے اور میرے بدن کی فطری خوشبو کستوری جیسی ہے، آپ آجائیے۔ ہم دونوں رات بھر ایک دوسرے میں جذب رہیں، وہ عورت ایسے گہرے جنگل کی ہوگی کہ جہاں پھولوں کے رنگ انتہائی تیز اور شوخ ہوں گے، جہاں کے پھل رسوں سے بھرے ہوں گے، جہاں کی مرچیں حد درجہ تیز ہوں گی اور جہاں جسم آزاد ہوگا! ایسی عورت کا تجربہ پوری زندگی کے حسن و جمال، نرمی اور گرمی اور پوری زندگی کی جنسی آسودگی کے تجربوں کے رس کا استعارہ ہے۔ عورت کے جسم کی خوشبو اگر اس طرح ملے کہ لوبان کی خوشبو وجود میں جذب ہونے لگے، دارچینی کی مہک کا احساس کو گرفت میں لینے لگے تو ٹپکتا ہوا تجربوں کا رس کتنا شیریں ہوگا۔ (''منٹو شناسی اور شکیل الرحمٰن''، ص-125)

منٹو کے افسانوں میں سیکس کا اصل جوہر Altimate جنسی لذتیت کے ان لمحوں کے بیان میں نظر آتا ہے جہاں منٹو کے نسوانی کرداروں کے بدن سے طرح طرح کی خوشبو نکلنے کا احساس ہوتا ہے۔ان کے ان تحریروں میں بھی نظر آتا ہے جہاں انہوں نے Sexuality کو Texuality میں تبدیل کر دیا ہے۔ اور وہاں بھی جہاں ان کے فن کی جمال وجلال اوران کی روح جنس سے متعلق افسانوں کے کرداروں کے جذبات واحساسات اور اعمال سے ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ منٹو نے یہ ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہہ جنس انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ جس سے انکار ممکن نہیں۔ منٹو کی تحریریں جنس کے گرد ہی طواف نہیں کرتیں بل کہ وہ جنس کی حقیقی ضرورت کو اجاگر کرتی ہیں۔ جنسی شعور کی پیش کش میں انھوں نے بغیر کم و کاست اور بلا خوف وخطر لکھا۔ان کا افسانہ سونورل معاشرتی عدم تواز ن،جنسی شعور، عورت کے جنسی مسائل اور نفسیات کی عکاسی کرتا ہے۔ اخلاقی رویوں کا فقدان

بھی اس افسانہ کی روح ہے۔کہانی کار نے ایسی عورت کو مرکزی کردار کے سانچے میں ڈھالا ہے جو رشتوں کی اہمیت سے ناواقف ہے۔اس کے نزدیک جنس اور عیاشی ہی زندگی کا حسن ہے۔خود کلامی اور مکالماتی تکنیک کے ذریعے لکھاری ایسی عورت کہانی بیان کرتا ہے جو مذہبی تعلیمات اور اخلاقی اقدار سے دور ہے۔وہ اپنے داماد سے ناجائز سمبندھ بناتی ہے ۔کرداروں میں قمر، یوسف، بشری اور پرویز شامل ہیں۔پرویز ایسی عورت ہے جو اپنے مرد سے محبت کرتی ہے اور اس کی ہر جائز و ناجائز خواہشات کو پورا کرتی ہے۔جب وہ اپنے خاوند یوسف کو اپنی ماں کے ساتھ بے پیرہن دیکھتی ہے تو سونورل کی گولیاں کھا کر زندگی سے مکتی پاتی ہے۔

شاداں کا کردار منٹو کے اقلیتی شعور کی عکاسی کرتا ہے۔کہانی میں ایسے افراد کی ذہنی پستی، کم علمی، انسان دشمنی اور عقلی فقدان کی عکاسی کی گئی ہے جو غیر مسلموں سے برا سلوک کرتے ہیں۔لیکن جنسی جذبات کی تسکین کے لیے ہر حد پار کر جاتے ہیں۔ان کے نزدیک جنس مذہب سے بالا تر ہے۔خان بہادر کنجِ تنہائی میں رہ کر شکار کی تلاش کرتا ہے اور ایک معصوم لڑکی کے جسم سے کھیلتا ہے۔شاداں معصوم مگر لالچی ہے جو خان بہادر کے شکنجے میں آ کر اپنی عزت کا جنازہ خود اٹھاتی ہے۔منٹو کہتا ہے کہ مرد جب جنس کے جال میں پھنس جاتا ہے تو وہ انسان نہیں بل کہ درندہ بن جاتا ہے۔وہ بھول جاتا ہے کہ سامنے کون ہے۔وہ بس جنسی تسکین چاہتا ہے اور بس۔

شاردا بھی جنس کے بوجھ سے جھک کر نزیر کی بانہوں میں عافیت محسوس کرتی ہے۔وہ اپنی مامتا کو بھول جاتی ہے اور جنسی لذت کے لیے اپنے لختِ جگر سے دور چلی جاتی ہے۔ایک لمحہ کے لیے وہ محبت کے دام میں آجاتی ہے لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ مرد اسے وہی دیتا جو وہ

چاہتی تھی۔

سرکنڈوں کی پیچھے   عورت کے متضاد رویوں کو بیان کرتی ہوئی کہانی ہے۔اس میں ایک طرف نواب ہے جو اس قدر سادہ لوح ہے کہ جب سردار اس سے پیشہ کراتی ہے تو وہ سوچتی ہے کہ جوان ہونے کے بعد ہر عورت کا یہی کام ہوتا ہے۔دوسری طرف شاہینہ ہے جو نواب کا قتل کر کے اس کا گوشت پکا ڈالتی ہے،صرف اس بنا پر کہ ہیبت خان نے اس سے بے وفائی کی تھی اور نواب کے یہاں آنے جانے لگا تھا۔

❁❁❁

سونورل

بشریٰ نے جب تیسری مرتبہ خواب آور دوا سونورل کی تین ٹکیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی تو میں سوچنے لگا کہ آخر یہ سلسلہ کیا ہے۔ اگر مرنا ہی ہے تو سنکھیا موجود ہے، افیم ہے۔ ان سمیات کے علاوہ اور بھی زہر ہیں جو بڑی آسانی سے دستیاب ہیں، ہر بار سونورل، ہی کیوں کھائی جاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ خواب آور دوا زیادہ مقدار میں کھائی جائے تو موت کا باعث ہوتی ہے لیکن بشریٰ کا تین مرتبہ صرف اسے ہی استعمال کرنا ضرور کوئی معنی رکھتا تھا۔ پہلے میں نے سوچا چونکہ دو مرتبہ دوا کھانے سے اس کی موت واقع نہیں ہوئی اس لیے وہ احتیاطاً اسے ہی استعمال کرتی ہے اور اسے اپنے اقدامِ خودکشی سے جو اثر پیدا کرنا ہوتا ہے، موت کے اِدھر اُدھر رہ کر کر لیتی ہے۔ لیکن میں سوچتا تھا کہ وہ اِدھر اُدھر بھی ہو سکتی تھی۔ یہ کوئی سو فیصد محفوظ طریقہ نہیں تھا۔

تیسری مرتبہ جب اس نے بتیس گولیاں کھائیں تو اس کے تیسرے شوہر کو جو پی ڈبلیو ڈی میں سب اوورسیر ہیں، صبح ساڑھے چھ بجے کے قریب پتہ چلا کہ وہ فالج زدہ بھینس کی مانند بے حس و حرکت پلنگ پر پڑی تھی۔ اس کو یہ خواب آور دوا کھائے غالباً تین چار گھنٹے ہو چکے تھے۔ سب اوورسیر صاحب سخت پریشان اور لرزاں میرے پاس آئے۔ مجھے سخت حیرت ہوئی، اس لیے کہ بشریٰ سے شادی کرنے کے بعد وہ مجھے قطعاً بھول چکے تھے۔ اس سے پہلے وہ ہر روز

میرے پاس آتے اور دونوں اکٹھے بیئر یا وسکی پیا کرتے تھے۔
ان دنوں وہ مفلوک الحال تھے۔سائیکل پر دفتر جاتے اور اسی پر گھر واپس آتے۔مگر جب ان کی بشریٰ سے دوستی ہوئی اور وہ اس سے شادی کر کے اسے اپنے گھر لائے تو نقشہ ہی بدل گیا۔ان کا بھی اور ان کے گھر کا بھی۔اب وہ بہت عمدہ سوٹ پہنتے تھے۔سواری کے لیے موٹر بھی آ گئی۔گھر بڑھیا سے بڑھیا فرنیچر سے آراستہ ہوگیا۔ریس کھیلنے لگے۔دیسی رم کے بجائے اب اسکاچ وسکی کے دوران کے یہاں چلتے تھے۔بشریٰ بھی پینے والی تھی اس لیے دونوں بہت خوش رہتے تھے۔

سب اوورسیر قمر صاحب کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ ہوگی۔بشریٰ ان سے غالباً پانچ برس بڑی تھی۔کسی زمانے میں شاید اس کی شکل وصورت قابل قبول ہو۔مگر اس عمر میں وہ بہت بھیانک تھی۔چہرے کی جھریوں والے گال پر شوخ میک اپ،بال کالے کیے ہوئے،بند بند ڈھیلا جیسے اوس میں پڑی ہوئی پتنگ ،ڈھلکا ہوا پیٹ،انگیا کے کرینوں سے اوپر اٹھائی ہوئی چھاتیاں،آنکھوں میں سرمے کی بدخط تحریر۔میں نے جب بھی اس کو دیکھا وہ مجھے نسوانیت کا ایک بھدا کارٹون سا دکھائی دی۔
قمر صاحب نے جیسا کہ ظاہر ہے اس میں اس کے سوا اور کیا خوبی دیکھی ہوگی کہ وہ مالدار تھی۔اس کا باپ پنجاب میں ایک بہت بڑا زمیندار تھا۔جس سے وراثت میں اس کو بہت زمینیں ملی تھیں۔ان سے چھ سات سو روپیہ ماہوار کی مستقل آمدن ہوجاتی تھی۔اس کے علاوہ بینک میں بھی اس کا دس،پندرہ ہزار روپیہ موجود تھا۔اور قمر صاحب ایک معمولی سب اوورسیر تھے۔بیوی تھی چھ بچے تھے،جن میں دو لڑکے تھے جو کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ان کے گھر

میں افلاس ہی افلاس تھا۔ ویسے شوقین مزاج تھے اور شاعر بھی۔ شام کو شراب بہت ضروری سمجھتے تھے اس لیے آپ خود ہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کے بال بچوں کے لیے کیا بچتا ہوگا۔

قمر صاحب نے یوں تو ظاہر کیا تھا کہ وہ بشریٰ کو شرعی طور پر اپنے رشتہ مناکحت میں لا چکے ہیں لیکن مجھے شک تھا اور اب بھی ہے کہ یہ محض ایک ڈھونگ تھا۔ قمر صاحب بڑے ہوشیار اور چالاک آدمی ہیں۔ اپنی زندگی کے پچپن برسوں میں نہ جانے وہ کتنے پاپڑ بیل چکے ہیں۔ سرد و گرم چشیدہ ہیں۔ گرگ باراں دیدہ ہیں۔ بشریٰ سے شادی کا جھنجھٹ پالنا کیسے منظور کر سکتے تھے۔

بشریٰ سے شادی کر کے قمر صاحب کے گھر میں حالت بہت حد تک سدھر چکی تھی۔ ان کی تین بچیاں جو سارا دن آوارہ پھرتی رہتی تھیں، عیسائیوں کے کسی اسکول میں داخل کرا دی گئی تھیں۔ ان کی پہلی بیوی کے کپڑے صاف ستھرے ہو گئے تھے۔ کھانا پینا بھی اب عمدہ تھا۔ میں خوش تھا کہ چلو اب ٹھیک ہے۔ دوسری شادی کی ہے، کچھ برا نہیں ہوا۔ بشریٰ کو ایک خاوند مل گیا ہے باسلیقہ اور ہوشیار ہے اور قمر صاحب کو ایک ایسی عورت مل گئی جو بدصورت سہی مگر مالدار تو ہے۔

مگر ان کا یہ سلسلہ زیادہ دیر تک مستحکم نہ رہا۔ کیونکہ ایک روز سننے میں آیا کہ ان کے درمیان بڑے زوروں کا جھگڑا ہوا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں نے سونورل کافی مقدار میں کھالی۔ کمرے میں فرش پر قمر صاحب بے ہوش پڑے تھے اور ان کی اہلیہ محترمہ پلنگ پر لاش کی مانند لیٹی تھیں۔ فوراً دونوں کو ہسپتال داخل کرایا گیا، جہاں سے وہ ٹھیک ٹھاک ہو کر واپس آ گئے مگر ابھی پندرہ روز بمشکل گزرے ہوں گے کہ پھر دونوں نے سونورل سے شغل فرمالیا۔

معلوم نہیں وہ ہسپتال پہنچائے گئے یا گھر میں ان کا علاج ہوا، بہر حال بچ گئے۔ اس کے بعد غالباً ایک برس تک ان کے یہاں ایسا کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔ لیکن ایک روز علی الصبح مجھے پتہ چلا کہ بشریٰ نے سونورل کی بتیس ٹکیاں کھالی ہیں۔
قمر صاحب سخت پریشان اور لرزاں تھے۔ ان کے حواس باختہ تھے۔ میں نے فوراً ہسپتال ٹیلی فون کیا اور ایمبولنس گاڑی منگوائی، بشریٰ کو وہاں پہنچایا گیا۔ ہاؤس سرجن اپنے کوارٹر میں تھے، میں نے ان کو وہاں سے نکالا اور سارا ماجرا سنا کر جلدی ہسپتال چلنے کے لیے کہا۔ ان پر میری عجلت طلب درخواست کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بڑے بے رحم انداز میں کہنے لگے، ''منٹو صاحب مرنے دیجیے اس کو۔ آپ کیوں گھبرا رہے ہیں؟''

ان کو معلوم تھا کہ بشریٰ اس سے پیشتر دو مرتبہ زہر خوری کے سلسلے میں ہسپتال آچکی ہے۔ میں نے ان سے بشریٰ کے بارے میں کچھ نہ پوچھا اور تھوڑی دیر بعد واپس گھر چلا آیا۔
میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے بشریٰ کا حدود اربعہ معلوم نہیں تھا اور اس کی زندگی کے سابقہ حالات میرے علم سے باہر تھے۔ میری اس کی متعدد مرتبہ ملاقات بھی ہو چکی تھی۔ وہ مجھے بھائی سعادت کہتی تھی۔ اس کے ساتھ کئی دفعہ پینے پلانے کا اتفاق بھی ہو چکا تھا۔ اس کی ایک لڑکی پرویز تھی۔ اس کی تصویر میں نے پہلی مرتبہ اس روز دیکھی جب وہ قمر صاحب کے گھر میں بحیثیت بیوی آئی۔ نیچے دو کمروں میں سامان وغیرہ سجایا جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا ایک قبول صورت جوان لڑکی کا فوٹو معمولی سے فریم میں مینٹل پیس پر پڑا ہے۔

جب بیئر کا دور چلا تو میں نے بشریٰ سے پوچھا کہ یہ فوٹو کس کا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کی لڑکی پرویز کا ہے، جس نے خودکشی کر لی تھی۔ میں نے جب اس کی وجہ دریافت کی تو مجھے قمر

صاحب اور بشریٰ سے جو باتیں معلوم ہوئیں، ان کو اگر کہانی کے انداز میں بیان کیا جائے تو کچھ اس قسم کی ہوں گی۔

پرویز بشریٰ کی پہلوٹھی کی لڑکی تھی جو اس کے پہلے خاوند سے پیدا ہوئی۔ وہ بھی کافی دولت مند زمیندار تھا۔ وہ مر گیا۔ مجھے دوسرے ذرائع سے معلوم ہوا کہ بشریٰ کا یہ پہلا خاوند جس کا نام اللہ بخش تھا اس سے شادی کے چند برسوں بعد ہی سخت متنفر ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ اس کی زندگی ہی میں بشریٰ نے کسی اور شخص سے آنکھ لڑانا شروع کر دی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بشریٰ کو اپنے خاوند کی نفرت اور حقارت سے بچنے کے لیے علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔ مرتے وقت اللہ بخش نے بشریٰ کو ایک کوڑی نہ دی لیکن اپنی بچی پرویز کے لیے کچھ جائیداد الگ کر دی۔

بشریٰ نے دوسری شادی کر لی۔ چونکہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال تھی اس لیے پشاور کا ایک کامیاب بیرسٹر اس کے دام میں گرفتار ہو گیا۔ اس سے اس کے یہاں دو لڑکے پیدا ہوئے۔ مگر اس دوسرے شوہر کے ساتھ بھی وہ زیادہ دیر تک جم کے نہ رہ سکی۔ چنانچہ اس سے طلاق حاصل کر لی۔ دراصل وہ آزاد زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔ یہ بیرسٹر ابھی تک زندہ ہے۔ دونوں لڑکے جوان ہیں اس کے پاس ہیں۔ یہ اپنی ماں سے نہیں ملتے۔ اس لیے کہ اس کا کردار انھیں پسند نہیں۔

یہ تو ہے بشریٰ کی زندگی کا مختصر خاکہ۔ اس کی بیٹی پرویز کی کہانی ذرا طویل ہے۔ اس کا بچپن زیادہ تر دیہات کی کھلی فضاؤں میں گزرا۔ بڑی نرم و نازک بچی تھی۔ سارا دن سرسبز کھیتوں میں کھیلتی تھی۔ اس کا ہمجولی کوئی نہ تھا۔ مزارعوں کے بچوں سے میل جول اس کے والدین کو پسند نہیں تھا۔ جب وہ کچھ بڑی ہوئی تو اسے لاہور کے ایک ایسے اسکول کے بورڈنگ ہاؤس

میں داخل کرادیا گیا جہاں بڑے بڑے امیروں کے بچے پڑھتے تھے۔

ذہین تھی۔ طبیعت میں جوہر تھا۔ جب اسکول سے نکل کر کالج میں داخل ہوئی تو وہ ایک خوبصورت دوشیزہ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ جس کا مضطرب دل و دماغ ہر وقت آئیڈیل کی تلاش میں رہتا تھا۔ بہت سُریلی تھی۔ جب گاتی تو سننے والے اس کی آواز سے مسحور ہو جاتے۔ رقص بھی اس نے سیکھا تھا۔ ناچتی تو دیکھنے والے مبہوت ہو جاتے۔ اس کے اعضا میں بلا کی لوچ تھی۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ جب وہ ناچتی تو اس کے اعضا کی خفیف سے خفیف حرکت بھی دیکھنے والوں سے ہم کلام ہوتی تھی۔
بہت بھولی بھالی تھی۔ اس میں وہی سادگی اور سادہ لوحی تھی جو گاؤں کے اکثر باشندوں میں ہوتی ہے۔ انگریزی اسکول میں پڑھی تھی۔ کالج میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کی سہلیوں میں بڑی تیز، شریر اور کائیاں لڑکیاں موجود تھیں۔ مگر وہ ان سب سے الگ تھی۔ وہ بادلوں سے بھی اوپر اس فضا میں رہتی تھی جو بڑی لطیف ہوتی ہے۔ اس کو دھن دولت کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ ایک ایسے نوجوان کے خواب دیکھتی تھی جس کو معبود بنا کر اس کی ساری زندگی عبادت میں گزر جائے۔ عشق و محبت کی جائے نماز پر وہ مجسم سجدہ تھی۔

اس کی ماں اسے ایبٹ آباد لے گئی تو وہاں مردوں اور عورتوں سے ملی جلی محفل منعقد ہوئی۔ پرویز کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنا رقص دکھائے۔ اس نے حاضرین پر نگاہ دوڑائی۔ ایک خوش پوش پٹھان نوجوان دور کونے میں کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر دمک تھی۔ ایک لمحے کے لیے پرویز کی نظریں اس پر رک گئیں۔ نوجوان نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کچھ کہا اور پرویز جو انکار کرنے والی تھی سب کچھ بھول کر بڑے دل فریب انداز میں

رقص کرنے لگی۔اس دوران میں اس نے اپنے لچکیلے اور گداز جسم کے بھاؤ اور ہر رنگ سے اپنی روح کے اندر چھپی ہوئی خواہشوں کو ایک ایک کر کے باہر نکالا اور اس پٹھان نوجوان کی محترم اور مسحور آنکھوں کے سامنے ترتیب وار سجا دیا۔

اس نوجوان کا نام یوسف غلزئی تھا۔اچھے دولت مند قبیلے کا ہونہار فرد۔فارغ التحصیل ہو کر اب بڑھ چڑھ کے ملکی سیاست میں حصہ لے رہا تھا۔عورت اس کے لیے عجوبہ نہیں تھی لیکن پرویز نے اسے موہ لیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کی شادی بڑے دھوم دھڑکے سے ہوئی اور وہ میاں بیوی بن کر ایبٹ آباد میں رہنے لگے۔پرویز بہت خوش تھی۔اس قدر خوش کہ اس کا جی چاہتا تھا ہر وقت رقصاں رہے۔ہر وقت اس کے ہونٹوں سے سہانے اور سماعت نواز گیت چشموں کی طرح پھوٹتے رہیں۔

وہ یوسف تھا تو پرویز اس کی زلیخا تھی۔اس کی عبادت میں دن رات مصروف رہتی تھی۔اس نے اپنی طرف سے اس کے قدموں میں تمام نسائیت کا جوہر نکال کر ڈال دیا تھا۔اس سے زیادہ کوئی عورت کیا کر سکتی ہے۔شروع شروع میں وہ بہت خوش رہی،اتنی خوش اور مسرور کہ اسے یہ محسوس تک نہ ہوا کہ اسے ازدواجی زندگی بسر کرتے ہوئے پورے تین برس گزر چکے ہیں۔اس کے ایک بچی ہوئی مگر وہ اپنے یوسف کی محبت میں اس قدر مستغرق تھی کہ کبھی کبھی اس کے وجود سے بالکل غافل ہو جاتی تھی۔

عجیب بات ہے کہ جب یہ لڑکی پیدا ہوئی تو اس نے یہ محسوس کیا کہ اس کے پیٹ سے بچی کے بجائے یوسف نکلا ہے۔اس کی محبت کو جنم دیا ہے۔اس سے آپ پرویز کی والہانہ محبت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔لیکن اس کے معبود کے قدم ثابت نہ رہے۔وہ طبعاً عیش پرست تھا۔وہ

مصری کی مکھی کی طرح نہیں بلکہ شہد کی مکھی کی طرح باغ کی ہر کلی کا رس چوسنا چاہتا تھا۔ چنانچہ کروٹ بدل کر اور پرویز کی محبت کی زنجیریں توڑنے کے بعد وہ پھر اپنے پہلے اشغال میں مصروف ہوگیا۔

اس کے پاس دولت تھی، جوانی تھی، پرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ ملکی سیاسیات میں سرگرم حصہ لینے کے باعث اس کا نام دن بہ دن روشن ہو رہا تھا۔ اس کو پرویز کی والہانہ محبت یکسر جہالت پر مبنی دکھائی دی۔ وہ اس سے اُکتا گیا۔ ہر وقت کی چوما چاٹی، منٹ منٹ کی بھینچا بھانچی اس کو سخت کھلنے لگی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ پرویز اسے مکڑی کی مانند اپنی محبت کے جالے میں بند کر دے جہاں وہ مرنڈا ہو جائے۔ اس کے بعد اسے سفوف میں تبدیل کر کے نسوار کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دے۔
پرویز کو جب معلوم ہوا کہ یوسف سالم کا سالم اس کا نہیں تو اسے سخت صدمہ ہوا۔ کئی دنوں تک وہ اس کے باعث گم سم اور نڈھال رہی۔ اس کو یوں محسوس ہوا کہ اس کے آئیڈیل کو ہتھوڑوں کی ظالم ضربوں نے چکنا چور کر کے ڈھیر کر دیا ہے۔

اس نے یوسف سے کچھ نہ کہا۔ اس کی بے اعتنائیوں اور بے وفائیوں کا کوئی ذکر نہ کیا۔ وہ کوئی حتمی فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔ طویل عرصے تک تنہائیوں میں رہ کر اس نے حالات پر غور کیا۔ یوسف سے چھٹکارا حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ لیکن وہ اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کو معبود کا رتبہ عطا کرنے والی وہ خود تھی۔ خدا کو اس کا بندہ کیسے رد کر سکتا ہے۔ جب کہ وہ ایک بار صدقِ دل سے اس کی خدائی تسلیم کر چکا ہو، اس کے حضور ہر وقت سجدہ ریز رہا ہو۔
اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ یوسف کے لیے نہیں صرف اپنے اس جذبے کی خاطر، جس نے

یوسف کو خدائی کا رتبہ بخشا تھا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے ساتھ رہے گی۔ وہ اس کے لیے بڑی سے بڑی قیمت دینے کے لیے بھی تیار تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس بے چاری نے یوسف کی آغوش کے لیے ہر اس عورت کے لیے آسانیاں پیدا کیں جو اس میں تھوڑی دیر کے لیے حرارت محسوس کرنا چاہتی تھی۔ یہ بڑی بے غیرتی تھی۔ مگر اس نے اپنے ٹوٹے پھوٹے آئیڈیل کو مکمل شکست وریخت سے بچانے کی خاطر فرار کا یہ عجیب وغریب راستہ اختیار کیا اور ہر قسم کی بے غیرتی برداشت کی۔

وہ اس کی چند روزہ محبوباؤں سے بڑے پیار ومحبت سے پیش آتی۔ ان کی خاطر تواضع کرتی۔ ان کی عصمت باختہ تلون مزاجیوں کو سر آنکھوں پر رکھتی اور ان کو اور اپنے خاوند کو ایسے موقع بہم پہنچاتی کہ اس کی موجودگی ان کے عیش وعشرت میں مخل نہ ہو پاتی۔ ان عورتوں کے لیے اپنے سینے پر پتھر رکھ کر وہ قسم قسم کے کھانے تیار کرتی، اس کا خاوند ان واہیات عورتوں کو خوش رکھنے کے لیے جب اسے حکم دیتا کہ ناچے اور گائے تو وہ ضبط سے کام لے کر کسی بھی لمحے برس پڑنے والی مصنوعی آنکھیں خوش دکھاتی۔ زخمی دل پر پھاہے لگاتی۔ غم وغصے سے کانپتے ہوئے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹیں پیدا کرتی، مسرت وانبساط سے بھرے ہوئے گیت گاتی اور بڑے طربناک انداز میں رقص کرتی۔ اس کے بعد وہ تنہائی میں اس قدر روتی، اس قدر آہیں بھرتی کہ اسے محسوس ہوتا کہ وہ اب نہیں جیے گی۔ مگر ایسے طوفان کے بعد اس میں ایک نئی قوتِ برداشت پیدا ہو جاتی تھی اور وہ یوسف کی دلالی میں اپنا منہ کالا کرنا شروع کر دیتی تھی اور خود کو یقین دلانے کی کوشش کرتی تھی کہ یہ کالک نہیں بڑا ہی خوش رنگ غازہ ہے۔
اس دوران میں اُس کی ماں اس سے ملنے کے لیے کئی مرتبہ آچکی تھی۔ مگر اس نے اپنے

خاوند کے متعلق اس سے کبھی شکایت نہیں کی تھی۔ وہ اپنے راز یا دکھ میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ان حالات میں وہ اپنے خاوند کی ذات کے ساتھ کسی اور کو کسی طریقے سے بھی وابستہ دیکھنا پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ یہ سوچتی کہ خاوند میرا ہے۔ وہ دکھ بھی میرا ہے۔ جو وہ مجھے پہنچا رہا ہے وہ اگر دوسری عورتوں کو بھی اسی قسم کا دکھ پہنچائے تو مجھے حسد ہو گا۔ لیکن وہ ایسا نہیں کرتا۔ اس لیے میں خوش ہوں۔

بشریٰ ان دنوں فارغ تھی۔ یعنی اس نے کوئی اپنا شوہر نہیں کیا ہوا تھا۔ اس کا وقت سیر و تفریح میں گزر رہا تھا۔ دس پندرہ دن ایبٹ آباد پرویز کے ساتھ رہتی۔ یوسف کے ساتھ اِدھر اُدھر گھومتی پھرتی۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ وہ گھنٹوں علیحدہ کمرے میں بیٹھے تاش کھیلنے میں گزارتے اور پرویز ان کی خاطر تواضع میں مصروف رہتی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی ماں زیادہ دیر تک اس کے پاس ٹھہرے تاکہ سوسائٹی کی ان عورتوں کا جو چکلے کی رنڈیوں سے بھی بدتر ہیں، اس گھر میں داخلہ بند رہے۔ مگر وہ ایک جگہ بہت عرصے تک ٹک کر نہیں رہ سکتی تھی۔ جب وہ چلی جاتی تو دوسرے تیسرے روز یوسف بھی اپنی پرانی ڈگر اختیار کر لیتا۔ پرویز دوسرا روپ دھار لیتی اور اپنے خاوند کی نت نئی سہیلیوں کے قدموں کے لیے پاانداز بن جاتی۔

اس نے اس زندگی کو آہستہ آہستہ اپنا لیا۔ اب اسے زیادہ کوفت نہیں ہوتی تھی۔ اس نے خود کو سمجھا بجھا کر راضی کر لیا تھا کہ اسے زندگی کے ڈرامے میں یہی رول ادا کرنا تھا جو وہ کر رہی تھی۔ چنانچہ اس سے اس کے دل و دماغ سے وہ کدورت جو پہلے پہلے بہت اذیت دہ تھی، قریب قریب دھل گئی تھی، وہ خوش رہتی اور اپنی ننھی بچی کی طرف زیادہ توجہ دینے لگی تھی۔

ایک دن اسے کسی ضروری کام سے اچانک لاہور جانا پڑا۔ دو دن کے بعد لوٹی تو شام کا وقت تھا۔ یوسف کا کمرہ بند تھا۔ مگر اس میں اس کے مخمور قہقہوں کی آواز سنائی دے رہے تھی۔ پرویز نے دروازے کی ایک درز سے جھانک کر دیکھا تو سرتاپا لرز گئی۔ اس کا پیازی رنگ ایک دم کاغذ کی مانند بے جان سفیدی اختیار کر گیا۔

یہ سارے واقعات مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوئے۔ بشریٰ نے مجھے جو کچھ بتایا اس سے مختلف تھا۔ اس کا بیان ہے کہ دل ہی دل میں کڑھ کڑھ کر وہ اپنی جان سے بیزار ہو گئی تھی۔ اس نے یوسف کی خاطر بڑی سے بڑی ذلت قبول کرنا گوارا تو کر لیا تھا، مگر اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ایک رات اس نے شراب کے نشے میں بدمست اپنی کسی چہیتی کو آغوش میں لیے پرویز سے کہا کہ ناچے اور ننگی ناچے۔ وہ اس کے کسی حکم کو نہیں ٹالتی تھی۔ یوسف اس کا خدا تھا، چنانچہ اس نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور اس کا عریاں بدن رقصاں تھا۔ ناچ ختم ہوا تو اس نے خاموشی سے کپڑے پہنے اور باہر نکل کر زہر کھالیا اور مر گئی۔

معلوم نہیں حقیقت کیا تھی لیکن جو کچھ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا، یہ ہے کہ جب پرویز نے یوسف کے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ وہ زندہ نہیں رہے گی، چنانچہ اسی وقت وہ موٹر میں سیدھی ایک کیمسٹ کی دکان پر گئی اور اس نے سونورل کی پوری ڈبیہ طلب کی۔ قیمت ادا کرنے لگی تو اسے معلوم ہوا کہ افراتفری کے عالم میں وہ اپنا پرس وہیں گھر پر بھول آئی ہے، چنانچہ اس نے کیمسٹ سے کہا کہ میں مسز یوسف غلزئی ہوں۔ پرس ساتھ نہیں لائی۔ بل بھجوا دیجیے گا۔ یوسف صاحب ادا کر دیں گے۔

گھر آ کے اس نے خادمہ کو ڈبیہ کی ساری گولیاں دیں اور اس سے کہا اچھی طرح پیس کے لاؤ۔ یہ سفوف اس نے گرم گرم دودھ میں ڈالا اور پی گئی۔

تھوڑی دیر بعد نوکر آیا اور اس نے پرویز سے کہا کہ آپ کی والدہ آئی ہیں، یوسف صاحب آپ کو بلاتے ہیں۔ پرویز کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ مگر ان میں غنودگی تھی۔ اس لیے کہ زہر کا اثر شروع ہو گیا تھا۔ منہ دھو کر اور بال سنوار کر وہ اندر گئی۔ اپنی ماں سے بغل گیر ہوئی اور یوسف کے ساتھ قالین پر بیٹھ گئی۔ ماں سے باتیں کرتے کرتے ایک دم پرویز کو چکر آیا اور وہ بے ہوش ہو کر ایک طرف لڑھک گئی۔ ماں نے تشویش کا اظہار کیا، اس لیے کہ اس کی بچی کا رنگ نیلا ہو رہا تھا۔ مگر یوسف نے جو نشے میں چور تھا کسی قسم کے تردد کا اظہار نہ کیا اور بشریٰ سے کہا، ''کچھ بھی نہیں ہوا اسے، بن رہی ہے۔''
پھر اس نے بڑے زور سے پرویز کا شانہ جھنجھوڑا اور حاکمانہ کہا، ''اُٹھ۔ مجھے یہ ایکٹنگ پسند نہیں۔''

بشریٰ نے بھی اس کو آوازیں دیں اس کو ہلایا جلایا۔ آخر ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ مگر وہ جب آیا تو پرویز اللہ کو پیاری ہو چکی تھی۔
پرویز کی خودکشی کے متعلق کئی قصے مشہور ہیں۔ لیکن اس کا جو پہلو مجھ پر معتبر ذرائع سے منکشف ہوا، میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ اس لیے میں خاموش رہا اور انتظار کرتا رہا کہ اس کی تصدیق کب ہوتی ہے۔

قمر صاحب بشریٰ کو ہسپتال سے واپس لائے تو میں ان سے ملا۔ ان کے پاس اب موٹر نہیں

تھی۔میں نے اس بارے میں استفسار کیا تو انھوں نے شاعرانہ بے اعتنائی اختیار کرتے ہوئے جواب دیا،''جس کی تھی لے گئی۔''میں نے پوچھا''کیا مطلب؟''جواب ملا،''مطلب یہ کہ موٹر میری کب تھی۔وہ تو ان محترمہ کی تھی۔میں نے کچھ عرصہ سے اس کا استعمال ترک کر دیا تھا۔اپنی سائیکل پر دفتر جاتا اور اسی پر واپس آتا تھا۔جب ان کو ضرورت ہوتی تو میں ڈرائیور کے فرائض ادا کرتا تھا۔''میں کچھ کچھ سمجھ گیا''کیا ناچاقی ہوگئی؟''
''ہاں کچھ ایسا ہی سمجھیے۔میں نے ان کو طلاق دے دی ہے۔''

بعد میں مجھے جب قمر صاحب سے مفصل گفتگو کرنے کا موقع ملا تو انھوں نے مجھے بتایا کہ نکاح وکاح کوئی نہیں ہوا تھا۔طلاق نامہ انھوں نے صرف اس لیے لکھا کہ لوگوں میں اس بات کی تشہیر نہ ہو کہ وہ غیر شرعی طور پر ان کے ساتھ قریب قریب دو برس رہیں۔
میں زیادہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ان کے درمیان جو فیصلہ کن لڑائی جھگڑا ہوا،اس کی وجہ یہ تھی کہ بقول قمر صاحب،ان کی محترمہ نے حیدرآباد کے ایک ادھیڑ عمر کے مہاجر رئیس سے جسمانی رشتہ قائم کرلیا تھا،اس لیے ان کے لیے قمر صاحب کی ذات میں وہ کشش ختم ہوگئی تھی جو کسی زمانے میں ان کو نظر آتی تھی۔بلکہ یوں کہیے کہ جس کو دیکھ کر ان کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔

مجھے افسوس ہوا،اس لیے کہ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ قمر صاحب نے اپنی تینوں ہونہار بچیوں کو اسکول سے اُٹھا لیا ہے،خود گولڈ فلیک کے بدلے بگلے کے سستے سگریٹ پیتے ہیں،پہلے تفریح کے اتنے سامان مہیا تھے،پر اب شُتر بے مہار کی طرح بے مطلب اِدھر اُدھر چکر لگاتے رہتے ہیں۔

محترمہ بشریٰ کے متعلق انھوں نے مجھے بہت کچھ بتایا لیکن میں یہ نہ سمجھ سکا کہ جب علیحدگی کا فیصلہ ہو چکا تھا اور حیدر آباد کے مہاجر رئیس صاحب نے بشریٰ کے ساتھ باقاعدہ راتیں گزارنا شروع کر رکھی تھیں تو ان کو سونورل کی بتیس گولیاں کھا کر خودکشی کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ بظاہر خطرناک فعل قمر صاحب کے اس اعتراض کا ردِعمل معلوم ہوتا ہے جو ان کو بشریٰ کے چال چلن پر تھا۔ لیکن ایمان کی بات ہے کہ مجھے اس کے عقب میں ایسا کوئی دل شکن عنصر نظر نہیں آتا جو انسان کو موت کی گود میں سو جانے پر مجبور کر دے۔ اس پر قمر صاحب بھی کوئی روشنی ڈالنے سے معذور رہیں۔

٥ایک دن باتوں باتوں میں ان سے میں آخر پوچھ ہی بیٹھا، "سونورل کھانے کی روایت جو بشریٰ کی بیٹی پرویز نے قائم کی، آپ نے اور بشریٰ نے جاری رکھی۔ لیکن آپ یہ بتائیے کہ وہ کون سی وجہ تھی جس نے اس غریب کو اتنے خطرناک اقدام کے لیے تیار کر دیا۔ آپ کئی بار مجھے بتا چکے ہیں کہ پرویز اپنے شوہر یوسف غلزئی کی حرام کاریوں کی عادی ہو چکی تھی۔ بلکہ وہ خود اس معاملے میں اس کی معاونت کرتی تھی۔ کوئی عورت جب اس حد تک پہنچ کر داشتہ بن جائے، خرابے کی انتہا کو پہنچ کر تعمیر کی نہایت ہی خوفناک صورت اختیار کرے، خودکشی کو وہ زبوں ترین فعل سمجھے، اس کو کبھی اس کا خیال تک نہیں آسکتا۔ میرا اپنا خیال ہے، بلکہ یقین ہے کہ اس کی ماں بشریٰ نے جسے آپ محترمہ کہتے ہیں، یوسف سے ایسے تعلقات پیدا کر لیے تھے جنھیں عام لوگ ناجائز کہتے ہیں"۔

قمر صاحب نے صرف ان الفاظ میں میری تصدیق کی، "یہ بالکل درست ہے۔ ایک دن شراب کے نشے میں بشریٰ نے اس کا اقرار کیا تھا اور بہت روئی تھی"۔

اس دن شام کو معلوم ہوا کہ حیدر آباد کے مہاجر رئیس صاحب نے سونورل کی چوبیس گولیاں کھالی ہیں۔ بشریٰ نے حسب معمول بتیس کھائی تھیں۔ دونوں ہسپتال میں بے ہوش پڑے تھے۔ دوسرے روز رئیس صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ چوبیس ہی میں ان کا کام تمام ہو گیا مگر بشریٰ بچ گئی۔

آج کل وہ مرحوم کا سوگ منا رہی ہے۔ جس شخص کے پاس اس نے موٹر بیچی تھی وہ دن رات اس کے پاس دل جوئی کے لیے موجود رہتا ہے۔

❁❁❁

سرکنڈوں کے پیچھے

کون سا شہر تھا، اس کے متعلق جہاں تک میں سمجھتا ہوں، آپ کو معلوم کرنے اور مجھے بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ جگہ جو اس کہانی سے متعلق ہے، پشاور کے مضافات میں تھی۔ سرحد کے قریب۔ اور جہاں وہ عورت تھی، اس کا گھر جھونپڑا نما تھا۔۔۔ سرکنڈوں کے پیچھے۔

گھنی باڑھ تھی، جس کے پیچھے اس عورت کا مکان تھا، کچی مٹی کا بنا ہوا۔ چونکہ یہ باڑھ سے کچھ فاصلے پر تھا، اس لیے سرکنڈوں کے پیچھے چھپ سا گیا تھا کہ باہر کچی سڑک پر سے گزرنے والا کوئی بھی اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ سرکنڈے بالکل سوکھے ہوئے تھے مگر وہ کچھ اس طرح زمین میں گڑے ہوئے تھے کہ ایک دبیز پردہ بن گیے تھے۔ معلوم نہیں اس عورت نے خود وہاں پیوست کیے تھے یا پہلے ہی سے موجود تھے۔ بہر حال، کہنا یہ ہے کہ وہ آہنی قسم کے پردہ پوش تھے۔

مکان کہہ لیجئے یا مٹی کا جھونپڑا، صرف چھوٹی چھوٹی تین کوٹھریاں تھیں مگر صاف ستھری۔ سامان مختصر تھا مگر اچھا۔ پچھلے کمرے میں ایک بہت بڑا نواڑی پلنگ تھا۔ اس کے ساتھ

ایک طاقچہ تھا جس میں سرسوں کے تیل کا دیا رات بھر جلتا رہتا تھا۔۔۔مگر یہ طاقچہ بھی صاف ستھرا رہتا تھا۔اور وہ دیا بھی جس میں ہر روز نیا تیل اور بتی ڈالی جاتی تھی۔

اب میں آپ کو اس عورت کا نام بتادوں جو اس مختصر سے مکان میں، جو سرکنڈوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا، اپنی جوان بیٹی کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔

مختلف روایتیں ہیں۔بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ اس کی بیٹی نہیں تھی ایک یتیم لڑکی تھی، جس کو اس نے بچپن سے گود لے کر پال پوس کر بڑا کیا تھا۔بعض کہتے ہیں کہ اس کی ناجائز لڑکی تھی۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ وہ اس کی سگی بیٹی تھی۔۔۔حقیقت جو کچھ بھی ہے، اس کے متعلق وثوق سے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ یہ کہانی پڑھنے کے بعد آپ خود بخود کوئی نہ کوئی رائے قائم کرلیجئے گا۔

دیکھیے، میں آپ کو اس عورت کا نام بتانا بھول گیا۔۔۔ بات اصل میں یہ ہے کہ اس کا نام کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔اس کا نام آپ کچھ بھی سمجھ لیجیے، سکینہ، مہتاب، گلشن یا کوئی اور۔آخر نام میں کیا رکھا ہے لیکن آپ کی سہولت کی خاطر میں اسے سردار کہوں گا۔

یہ سردار، ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔کسی زمانے میں یقیناً خوبصورت تھی۔اس کے سرخ وسفید گالوں پر گو کسی قدر جھریاں پڑ گئی تھیں، مگر پھر بھی وہ اپنی عمر سے کئی برس چھوٹی دکھائی دیتی تھی مگر ہمیں اس کے گالوں سے کوئی تعلق نہیں۔

اس کی بیٹی، معلوم نہیں وہ اس کی بیٹی تھی یا نہیں، شباب کا بڑا دلکش نمونہ تھی۔اس کے خدوخال میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکے کہ وہ فاحشہ ہے۔لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کی ماں اس سے پیشہ کراتی تھی اور خوب دولت کما رہی تھی۔اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس

لڑکی کو، جس کا نام پھر آپ کی سہولت کی خاطر نواب رکھے دیتا ہوں، کو اس پیشے سے نفرت نہیں تھی۔

اصل میں اس نے آبادی سے دور ایک ایسے مقام پر پرورش پائی تھی کہ اس کو صحیح ازدواجی زندگی کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ جب سردار نے اس سے پہلا مرد بستر پر۔۔۔نواڑی پلنگ پر متعارف کروایا تو غالباً اس نے یہ سمجھا کہ تمام لڑکیوں کی جوانی کا آغاز کچھ اسی طرح ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی اس کسبیانہ زندگی سے مانوس ہوگئی تھی اور وہ مرد جو دور دور سے چل کر اس کے پاس آتے تھے اور اس کے ساتھ اس بڑے نواڑی پلنگ پر لیٹتے تھے، اس نے سمجھا تھا کہ یہی اس کی زندگی کا منتہیٰ ہے۔

یوں تو وہ ہر لحاظ سے ایک فاحشہ عورت تھی، ان معنوں میں جن میں ہماری شریف اور مطہر عورتیں ایسی عورتوں کو دیکھتی ہیں، مگر سچ پوچھیے تو اس امر کا قطعاً احساس نہ تھا کہ وہ گناہ کی زندگی بسر کر رہی ہے۔۔۔وہ اس کے متعلق غور بھی کیسے کرسکتی تھی جب کہ اس کو اس کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اس کے جسم میں خلوص تھا۔ وہ ہر مرد کو جو اس کے پاس ہفتے ڈیڑھ ہفتے کے بعد طویل مسافت طے کر کے آتا تھا، اپنا آپ سپرد کر دیتی تھی، اس لیے کہ وہ یہ سمجھتی تھی کہ ہر عورت کا یہی کام ہے۔ اور وہ اس مرد کی ہر آسائش، اس کے ہر آرام کا خیال رکھتی تھی۔ وہ اس کی کوئی ننھی سی تکلیف بھی برداشت نہیں کرسکتی تھی۔

اس کو شہر کے لوگوں کے تکلفات کا علم نہیں تھا۔ وہ یہ قطعاً نہیں جانتی تھی کہ جو مرد اس کے پاس آتے ہیں، صبح سویرے اپنے دانت برش کے ساتھ صاف کرنے کے عادی ہیں اور آنکھیں کھول کر سب سے پہلے بستر میں چائے کی پیالی پیتے ہیں، پھر رفع حاجت کے لیے

جاتے ہیں، مگر اس نے آہستہ آہستہ بڑے الہڑ طریقے پر ان مردوں کی عادات سے کچھ واقفیت حاصل کرلی تھی۔ پر اسے بڑی الجھن ہوتی تھی کہ سب مرد ایک طرح کے نہیں ہوتے تھے۔کوئی صبح سویرے اٹھ کر سگریٹ مانگتا تھا،کوئی چائے اور بعض ایسے بھی ہوتے جو اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ کچھ ساری رات جاگتے رہتے اور صبح موٹر میں سوار ہو کر بھاگ جاتے تھے۔

سردار بے فکر تھی۔ اس کو اپنی بیٹی پر، یا جو کچھ بھی وہ تھی، پورا اعتماد تھا کہ وہ اپنے گاہکوں کو سنبھال سکتی ہے، اس لیے وہ افیم کی ایک گولی کھا کر کھاٹ پر سوئی رہتی تھی۔ کبھی کبھار جب اس کی ضرورت پڑتی ۔۔۔مثال کے طور پر جب کسی گاہک کی طبیعت زیادہ شراب پینے کے باعث یکدم خراب ہوتی تو وہ غنودگی کے عالم میں اٹھ کر نواب کو ہدایات دے دیتی تھی کہ اس کو اچار کھلا دے یا کوشش کرے کہ وہ نمک ملا گرم گرم پانی پلا کر قے کرادے اور بعد میں تھپکیاں دے کر سلا دے۔

سرداراس معاملے میں بڑی محتاط تھی کہ جونہی گاہک آتا، وہ اس سے نواب کی فیس پہلے وصول کرکے اپنے نیفے میں محفوظ کر لیتی تھی اور اپنے مخصوص انداز میں دعائیں دے کر کہ تم آرام سے جھولے جھولو، افیم کی ایک گولی ڈبیا میں سے نکال کر منہ میں ڈال کر سو جاتی۔
جو روپیہ آتا، اس کی مالک سردار تھی۔ لیکن جو تحفے تحائف وصول ہوتے، وہ نواب ہی کے پاس رہتے تھے۔ چونکہ اس کے پاس آنے والے لوگ دولت مند ہوتے، اس لیے وہ بڑھیا کپڑا پہنتی اور قسم قسم کے پھل اور مٹھائیاں کھاتی تھی۔

وہ خوش تھی۔۔۔مٹی سے لپے پتے اس مکان میں جو صرف تین چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں پر مشتمل

تھا، وہ اپنی دانست کے مطابق بڑی دلچسپ اور خوش گوار زندگی بسر کر رہی تھی۔۔۔ایک فوجی افسر نے اسے گراموفون اور بہت سے ریکارڈ لا دیے تھے۔فرصت کے اوقات میں وہ ان کو بجا بجا کر فلمی گانے سنتی اور ان کی نقل اتارنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔اس کے گلے میں کوئی رس نہیں تھا مگر شاید وہ اس سے بے خبر تھی۔۔۔سچ پوچھیے تو اس کو کسی بات کی خبر بھی نہیں تھی اور نہ اس کو اس بات کی خواہش تھی کہ وہ کسی چیز سے باخبر ہو۔جس راستے پر وہ ڈال دی گئی تھی، اس کو اس نے قبول کر لیا تھا۔۔۔بڑی بے خبری کے عالم میں۔
سرکنڈوں کے اس پار کی دنیا کیسی ہے، اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتی تھی سوائے اس کے کہ ایک کچی سڑک ہے جس پر ہر دوسرے تیسرے دن ایک موٹر دھول اڑاتی ہوئی آتی ہے اور رک جاتی ہے۔ہارن بجتا ہے۔اس کی ماں یا جو کوئی بھی وہ تھی، کھٹیا سے اٹھتی ہے اور سرکنڈوں کے پاس جا کر موٹر والے سے کہتی ہے کہ موٹر ذرا دور کھڑی کر کے اندر آجائے۔اور وہ اندر آجاتا ہے اور نواڑی پلنگ پر اس کے ساتھ بیٹھ کر میٹھی میٹھی باتوں میں مشغول ہو جاتا ہے۔

اس کے ہاں آنے جانے والوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔یہی پانچ چھ ہوں گے مگر یہ پانچ چھ مستقل گاہک تھے اور سردار نے کچھ ایسا انتظام کر رکھا تھا کہ ان کا باہم تصادم نہ ہو۔بڑی ہوشیار عورت تھی۔۔۔وہ ہر گاہک کے لیے خاص دن مقرر کر دیتی، اور ایسے سلیقے سے کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملتا تھا۔
اس کے علاوہ ضرورت کے وقت وہ اس کا بھی انتظام کرتی رہتی کہ نواب ماں نہ بن جائے۔ جن حالات میں نواب اپنی زندگی گزار رہی تھی، ان میں اس کا ماں بن جانا یقینی تھا مگر

سر دار دو ڈھائی برس سے بڑی کامیابی کے ساتھ اس قدرتی خطرے سے نبٹ رہی تھی۔

سرکنڈوں کے پیچھے یہ سلسلہ دو ڈھائی برس سے بڑے ہموار طریقے پر چل رہا تھا۔ پولیس والوں کو بالکل علم نہیں تھا۔ بس صرف وہی لوگ جانتے تھے جو وہاں آتے تھے۔ یا پھر سر دار اور اس کی بیٹی نواب، یا جو کوئی بھی وہ تھی۔
سرکنڈوں کے پیچھے، ایک دن مٹی کے اس مکان میں ایک انقلاب برپا ہوگیا۔ ایک بہت بڑی موٹر جو غالباً ڈوج تھی وہاں آ کے رکی۔ ہارن بجا۔ سر دار باہر آئی تو اس نے دیکھا کوئی اجنبی ہے۔ اس نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ اجنبی نے بھی اس سے کچھ نہ کہا۔ موٹر دور کھڑی کر کے وہ اترا اور سیدھا ان کے گھر میں گھس گیا جیسے برسوں کا آنے جانے والا ہو۔

سر دار بہت سٹپٹائی، لیکن دروازے کی دہلیز پر نواب نے اس اجنبی کا بڑی پیاری مسکراہٹ سے خیر مقدم کیا اور اسے اس کمرے میں لے گئی جس میں نواڑی پلنگ تھا۔ دونوں اس پر ساتھ ساتھ بیٹھے ہی تھے کہ سر دار آ گئی۔۔۔ ہوشیار عورت تھی۔ اس نے دیکھا کہ اجنبی کسی دولت مند گھرانے کا آدمی ہے۔ خوش شکل ہے، صحت مند ہے۔ اس نے اندر کوٹھری میں داخل ہو کر سلام کیا اور پوچھا، ''آپ کو ادھر کا راستہ کس نے بتایا؟''
اجنبی مسکرایا اور بڑے پیار سے نواب کے گوشت بھرے گالوں میں اپنی انگلی چبھو کر کہا، ''اس نے؟''

نواب تڑپ کر ایک طرف ہٹ گئی، ایک ادا کے ساتھ کہا، ''ہائیں۔۔۔ میں تو کبھی تم سے ملی بھی نہیں؟''

اجنبی کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر اور زیادہ پھیل گئی۔ ”ہم تو کئی بار تم سے مل چکے ہیں۔“

نواب نے پوچھا، ”کہاں۔۔۔کب؟“ حیرت کے عالم میں اس کا چھوٹا سا منہ کچھ اس طور پر وا ہوا کہ اس کے چہرے کی دلکشی میں اضافے کا موجب ہوگیا۔ اجنبی نے اس کا گدگدا ہاتھ پکڑ لیا اور سردار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ”تم یہ باتیں ابھی نہیں سمجھ سکتیں۔۔۔اپنی ماں سے پوچھو۔“

نواب نے بڑے بھول پن کے ساتھ اپنی ماں سے پوچھا کہ یہ شخص اس سے کب اور کہاں ملا تھا۔ سردار سارا معاملہ سمجھ گئی کہ وہ لوگ جو اس کے یہاں آتے ہیں، ان میں سے کسی نے اس کے ساتھ نواب کا ذکر کیا ہوگا اور سارا اتا پتا بتا دیا ہوگا چنانچہ اس نے نواب سے کہا، ”میں بتادوں گی تمہیں۔“ اور یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئی۔ کھٹیا پر بیٹھ کر اس نے ڈبیا میں سے افیم کی گولی نکالی اور لیٹ گئی۔ وہ مطمئن تھی کہ آدمی اچھا ہے گڑبڑ نہیں کرے گا۔

وثوق سے اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن اغلب یہی ہے کہ اجنبی جس کا نام ہیبت خان تھا اور ضلع ہزارہ کا بہت بڑا رئیس تھا، نواب کے الھڑ پن سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے رخصت ہوتے وقت سردار سے کہا کہ آئندہ نواب کے پاس اور کوئی نہ آیا کرے۔ سردار ہوشیار عورت تھی۔ اس نے ہیبت خان سے کہا، ”خان صاحب! یہ کیسے ہوسکتا ہے۔۔۔کیا آپ اتنا روپیہ دے سکیں گے کہ۔۔۔“

ہیبت خان نے سردار کی بات کاٹ کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور سوسو کے نوٹوں کی ایک موٹی گڈی نکالی اور نواب کے قدموں میں پھینک دی۔ پھر اس نے اپنی ہیرے کی انگوٹھی انگلی سے نکالی اور نواب کو پہنا کر تیزی سے سرکنڈوں کے اس پار چلا گیا۔

نواب نے نوٹوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ بس دیر تک اپنی سجی ہوئی انگلی کو دیکھتی رہی جس پر کافی بڑے ہیرے سے رنگ رنگ کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ موٹر اسٹارٹ ہوئی اور دھول اڑاتی چلی گئی۔ اس کے بعد وہ چونکی اور سرکنڈوں کے پاس آئی، مگر اب گرد و غبار کے سوا سڑک پر کچھ نہ تھا۔

سردار نوٹوں کی گڈی اٹھا کر انھیں گن چکی تھی۔ ایک نوٹ اور ہوتا تو پورے دو ہزار تھے۔ مگر اس کو اس کا افسوس نہیں تھا۔ سارے نوٹ اس نے اپنی گھیرے دار شلوار کے نیفے میں بڑی صفائی سے اڑسے اور نواب کو چھوڑ کر اپنی کھٹیا کی طرف بڑھی اور ڈبیا میں سے افیم کی ایک بڑی گولی نکال کر اس نے منہ میں ڈالی اور بڑے اطمینان سے لیٹ گئی اور دیر تک سوتی رہی۔

نواب بہت خوش تھی۔ بار بار اپنی اس انگلی کو دیکھتی تھی جس پر ہیرے کی انگوٹھی تھی۔۔۔ تین چار روز گزر گیے۔ اس دوران میں اس کا ایک پرانا گاہک آیا جس سے سردار نے کہہ دیا کہ پولیس کا خطرہ ہے، اس لیے اس نے یہ دھندہ بند کر دیا ہے۔ یہ گاہک جو خاصا دولت مند تھا، بے نیل و مرام واپس چلا گیا۔ سردار کو ہیبت خان نے بہت متاثر کیا تھا۔ اس نے افیم کھا کر پینگ کے عالم میں سوچا تھا کہ اگر آمدن اتنی ہی رہے جتنی کہ پہلے تھی اور آدمی صرف ایک ہو تو بہت اچھا ہے۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ باقیوں کو آہستہ آہستہ یہ کہہ کر ٹرخا دے گی کہ پولیس والے اس کے پیچھے ہیں اور یہ نہیں دیکھ سکتی کہ ان کی عزت خطرے میں پڑے۔

ہیبت خان ایک ہفتے کے بعد نمودار ہوا۔ اس دوران میں سردار دو گاہکوں کو منع کر چکی تھی کہ وہ اب ادھر کا رخ نہ کریں۔ وہ اسی شان سے آیا جس شان سے پہلے روز آیا تھا۔ آتے ہی اس

نے نواب کو اپنی چھاتی کے ساتھ بھینچ لیا۔سر دار نے اس سے کوئی بات نہ کی۔نواب اسے۔۔۔بلکہ یوں کہیے کہ ہیبت خان اسے اس کوٹھری میں لے گیا جہاں نواڑی پلنگ تھا۔اب کے سر دار اندر نہ آئی اور اپنی کھٹیا پر افیم کی گولی کھا کر اونگھتی رہی۔

ہیبت خان بہت محظوظ ہوا۔اس کو نواب کا الہڑ پن اور بھی زیادہ پسند آیا۔وہ پیشہ ور رنڈیوں کے چلتروں سے قطعاً ناواقف تھی۔اس میں وہ گھریلو پن بھی نہیں تھا جو عام عورتوں میں ہوتا ہے۔ اس میں کوئی ایسی بات تھی جو خود اس کی اپنی تھی۔دوسروں سے مختلف۔وہ بستر میں اس کے ساتھ اس طرح لیٹتی تھی،جس طرح بچہ اپنی ماں کے ساتھ لیٹتا ہے۔اس کی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرتا ہے۔اس کی ناک کے نتھنوں میں انگلیاں ڈالتا ہے،اس کے بال نوچتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ سو جاتا ہے۔

ہیبت خان کے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔اس کے لیے عورت کی یہ قسم بالکل نرالی،دلچسپ اور فرحت بخش تھی۔وہ اب ہفتے میں دو بار آنے لگا تھا۔نواب اس کے لیے ایک بے پناہ کشش بن گئی تھی۔سر دار خوش تھی کہ اس کے نیفے میں اڑسنے کے لیے کافی نوٹ مل جاتے ہیں۔۔۔ لیکن نواب اپنے الہڑ پن کے باوجود بعض اوقات سوچتی تھی کہ ہیبت خان ڈرا ڈرا سا کیوں رہتا ہے۔اگر پکی سڑک پر سے،سرکنڈوں کے اس پار کوئی لاری یا موٹر گزرتی ہے تو وہ کیوں سہم جاتا ہے۔کیوں اس سے الگ ہو کر باہر نکل جاتا ہے اور چھپ چھپ کر دیکھتا ہے کہ کون تھا۔

ایک رات بارہ بجے کے قریب سڑک پر سے کوئی لاری گزری۔ہیبت خان اور نواب دونوں ایک دوسرے سے گتھے ہوئے سو رہے تھے کہ ایک دم ہیبت خان بڑے زور سے کانپا اور اٹھ

کر بیٹھ گیا۔نواب کی نیند بڑی ہلکی تھی۔وہ کانپا تو وہ سر سے پیر تک یوں لرزی جیسے اس کے اندر زلزلہ آگیا ہے۔چیخ کر اس نے پوچھا،''کیا ہوا؟''

ہیبت خان اب کسی قدر سنبھل چکا تھا۔اس نے خود کو اور زیادہ سنبھال کر اس سے کہا،''کوئی بات نہیں۔۔۔میں۔۔۔میں شاید خواب میں ڈر گیا تھا۔''

لاری کی آواز دور سے رات کی خاموشی میں ابھی تک آرہی تھی۔

نواب نے اس سے کہا،''نہیں خان۔۔۔کوئی اور بات ہے۔جب بھی کوئی موٹر یا لاری سڑک پر سے گزرتی ہے،تمہاری یہی حالت ہوتی ہے۔''

ہیبت خان کی شاید یہ دکھتی رگ تھی جس پر نواب نے ہاتھ رکھ دیا تھا۔اس نے اپنا مردانہ وقار قائم رکھنے کے لیے بڑے تیز لہجے میں کہا،'' بکتی ہو تم۔۔۔موٹروں اور لاریوں سے ڈرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟''

نواب کا دل بہت نازک تھا۔ہیبت خان کے تیز لہجے سے اس کو ٹھیس لگی اور اس نے بلک بلک کر رونا شروع کر دیا۔ہیبت خان نے جب اس کو چپ کرایا تو وہ اپنی زندگی کے ایک لطیف ترین خط سے آشنا ہوا اور اس کا جسم نواب کے جسم سے اور زیادہ قریب ہو گیا۔

ہیبت خان اچھے قد کاٹھ کا آدمی تھا۔اس کا جسم گٹھا ہوا تھا۔خوبصورت تھا۔اس کی باہنوں میں نواب نے پہلی بار بڑی پیاری حرارت محسوس کی تھی۔اس کو جسمانی لذت کی الف بے اسی نے سکھائی تھی۔وہ اس سے محبت کرنے لگی تھی۔یوں کہیے کہ وہ شے جو محبت ہوتی ہے،اس کے معانی اب اس پر آشکار ہو رہے تھے۔وہ اگر ایک ہفتہ غائب رہتا تو نواب گراموفون پر دردیلے گیتوں کے ریکارڈ لگا کر خود ان کے ساتھ گاتی اور آہیں بھرتی تھی۔مگر اس کو اس بات

کی بڑی الجھن تھی کہ ہیبت خان موٹروں کی آمدورفت سے کیوں گھبراتا ہے۔
مہینوں گزر گیے۔نواب کی سپردگی اور اس کے التفات میں اضافہ ہوتا گیا۔مگر ادھر اس کی الجھن بڑھتی گئی کہ اب ہیبت خان چند گھنٹوں کے لیے آتا اور افراتفری کے عالم میں واپس چلا جاتا تھا۔نواب محسوس کر رہی تھی کہ یہ سب کسی مجبوری کی وجہ سے ہے، ورنہ ہیبت خان کا جی چاہتا ہے کہ وہ زیادہ دیر ٹھہرے۔

اس نے کئی مرتبہ اس سے اس بارے میں پوچھا، مگر وہ گول کر گیا۔ایک دن صبح سویرے اس کی ڈوج سرکنڈوں کے پار رکی۔نواب سو رہی تھی۔ ہارن بجا تو چونک کر اٹھی۔آنکھیں ملتی ملتی باہر آئی۔اس وقت تک ہیبت خان اپنی موٹر دور کھڑی کر کے مکان کے پاس پہنچ چکا تھا۔ نواب دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔وہ اسے اٹھا کر اندر کمرے میں لے گیا جہاں نواڑ کا پلنگ تھا۔ دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے۔ پیار محبت کی باتیں۔۔۔معلوم نہیں نواب کے دل میں کیا آئی کہ اس نے اپنی زندگی کی پہلی فرمائش کی۔"خان۔۔۔مجھے سونے کے کڑے لا دو۔"

ہیبت خان نے اس کی موٹی موٹی گوشت بھری سرخ وسفید کلائیوں کو کئی مرتبہ چوما اور کہا،"کل ہی آجائیں گے۔تمہارے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔"
نواب نے ایک ادا کے ساتھ، مگر اپنے مخصوص الہڑ انداز میں کہا،"خان صاحب۔۔۔جانے دیجیے۔۔۔جان تو مجھے ہی دینی پڑے گی۔"

ہیبت خان یہ سن کر کئی بار اس کے صدقے ہوا۔۔۔اور بڑا پر لطف وقت گزار کے چلا گیا، اور وعدہ کر گیا کہ وہ دوسرے دن آئے گا اور سونے کے کڑے اس کے نرم نرم ہاتھوں میں خود

پہنائے گا۔

نواب خوش تھی۔اس رات وہ دیر تک مسرت بھرے ریکارڈ بجا بجا کر اس چھوٹی سی کوٹھری میں ناچتی رہی جس پر نواڑی پلنگ تھا۔۔۔سردار بھی خوش تھی۔اس رات اس نے پھر اپنی ڈبیا سے افیم کی ایک بڑی گولی نکالی اور اسے نگل کر سو گئی۔

دوسرے دن نواب اور زیادہ خوش تھی کہ سونے کے کڑے آنے والے ہیں اور ہیبت خان خود اس کو پہنانے والا ہے۔وہ سارا دن منتظر رہی پر وہ نہ آیا۔اس نے سوچا شاید موٹر خراب ہو گئی ہو۔۔۔شاید رات ہی کو آئے مگر وہ ساری رات جاگتی رہی اور ہیبت خان نہ آیا۔اس کے دل کو، جو بہت نازک تھا، بڑی ٹھیس پہنچی۔اس نے اپنی ماں کو، یا جو کچھ بھی وہ تھی، بار بار کہا ''دیکھو، خان نہیں آیا، وعدہ کر کے پھر گیا ہے۔'' لیکن پھر وہ سوچتی اور کہتی ''ایسا نہ ہو، کچھ ہو گیا ہو۔'' اور وہ سہم جاتی۔

کئی باتیں اس کے دماغ میں آتی تھیں۔موٹر کا حادثہ، اچانک بیماری، کسی ڈاکو کا حملہ۔۔۔لیکن بار بار اس کو لاریوں اور موٹروں کی آوازوں کا خیال آتا تھا جن کو سن کر ہیبت خان ہمیشہ بوکھلا جاتا تھا۔۔۔وہ اس کے متعلق پہروں سوچتی تھی، مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔اس دوران میں اس کا کوئی پرانا گاہک بھی نہ آیا، اس لیے کہ سردار ان سب کو منع کر چکی تھی۔تین چار لاریاں اور دو موٹریں البتہ اس کچی سڑک پر سے دھول اڑاتی گزریں۔نواب کا ہر بار یہی جی چاہا کہ دوڑتی ہوئی ان کے پیچھے جائے اور ان کو آگ لگا دے۔اس کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہی وہ چیزیں ہیں جو ہیبت خان کے یہاں آنے میں رکاوٹ کا باعث ہیں، مگر پھر سوچتی کہ موٹریں اور لاریاں رکاوٹ کا کیا باعث ہو سکتی ہیں، وہ اپنی کم عقلی پر ہنستی۔

لیکن یہ بات اس کے فہم سے بالاتر تھی کہ ہیبت خان جیسا تنومند مرد ان کی آواز سن کر سہم کیوں جاتا ہے۔اس حقیقت کو اس کے دماغ کی پیدا کی ہوئی دلیل جھٹلا نہیں سکتی تھی۔اور جب ایسا ہوتا تو بے حد رنجیدہ اور مغموم ہو جاتی اور گراموفون پر درد بھرے ریکارڈ لگا کر سننا شروع کر دیتی اور اس کی آنکھیں نمناک ہو جاتیں۔

ایک ہفتے کے بعد دوپہر کو جب نواب اور سردار کھانا کھا کر فارغ ہو چکی تھیں اور کچھ دیر آرام کرنے کی سوچ رہی تھیں کہ اچانک باہر سڑک پر سے موٹر کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ دونوں یہ آواز سن کر چونکیں کیوں کہ ہیبت خان کی ڈوج کے ہارن کی آواز نہیں تھی۔۔۔سردار باہر لپکی کہ دیکھے کون ہے، پرانا آدمی ہوا تو اسے ٹرخا دے گی۔مگر جب وہ سرکنڈوں کے پاس پہنچی تو اس نے دیکھا کہ ایک نئی موٹر میں ہیبت خان بیٹھا ہے۔پچھلی نشست پر ایک خوش پوش اور خوبصورت عورت ہے۔

ہیبت خان نے موٹر کچھ دور کھڑی کی اور باہر نکلا۔اس کے ساتھ ہی پچھلی نشست سے وہ عورت۔۔۔دونوں ان کے مکان کی طرف بڑھے۔سردار نے سوچا کہ یہ کیا سلسلہ ہے۔عورت کے لیے تو ہیبت اتنی دور سے چل کر یہاں آتا ہے، پھر یہ عورت جو اتنی خوبصورت ہے، جوان ہے، قیمتی کپڑوں میں ملبوس ہے، اس کے ساتھ یہاں کیا کرنے آئی ہے۔

وہ ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ ہیبت خان اس خوبصورت کے ساتھ جس نے بیش قیمت زیور پہنے ہوئے تھے، مکان میں داخل ہو گیا۔وہ ان کے پیچھے پیچھے چلی۔اس کی طرف ان دونوں میں سے کسی نے دھیان ہی نہیں دیا تھا۔جب وہ اندر گئی تو ہیبت خان، نواب اور وہ عورت تینوں نواڑی پلنگ پر بیٹھے تھے اور خاموشی طاری تھی۔۔۔عجیب قسم کی خاموشی۔زیوروں سے لدی

پھندی عورت البتہ کسی قدر مضطرب نظر آتی تھی کہ اس کی ایک ٹانگ بڑے زور سے ہل رہی تھی۔

سردار دہلیز کے پاس ہی کھڑی ہوگئی۔ اس کے قدموں کی آہٹ سن کر جب ہیبت خان نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے سلام کیا۔۔۔ ہیبت خان نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سخت بوکھلایا ہوا تھا۔ اس عورت کی ٹانگ ہلنا بند ہوئی اور وہ سردار سے مخاطب ہوئی، ''ہم آئے ہیں۔ کھانے پینے کا تو بندوبست کرو۔'' سردار نے سرتاپا مہمان نواز بن کر کہا، ''جو تم کہو، ابھی تیار ہو جاتا ہے۔'' اس عورت نے جس کے خدوخال سے صاف مترشح تھا کہ بڑی دھڑلے کی عورت ہے، سردار سے کہا، ''تو چلو تم باورچی خانے میں۔۔۔ چولہا سلگاؤ۔۔۔ بڑی دیگچی ہے گھر میں؟''

''ہے!'' سردار نے اپنا وزنی سر ہلایا۔

''تو جاؤ اس کو دھو کر صاف کرو۔ میں ابھی آئی۔'' وہ عورت پلنگ پر سے اٹھی اور گراموفون کو دیکھنے لگی۔

سردار نے معذرت بھرے لہجے میں اس سے کہا، ''گوشت وغیرہ تو، یہاں نہیں ملے گا۔''

اس عورت نے ایک ریکارڈ پر سوئی رکھی، ''مل جائے گا۔ تم سے جو کہا ہے، وہ کرو۔۔۔ اور دیکھو آگ کافی ہو۔''

سردار یہ احکام لے کر چلی گئی۔ اب وہ خوش پوش عورت مسکرا کر نواب سے مخاطب ہوئی، ''نواب! ہم تمہارے لیے سونے کے کڑے لے کر آئے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا وینٹی

بیگ کھولا اوراس میں سے باریک سرخ کاغذ میں لپٹے ہوئے کڑے نکالے جو کافی وزنی اور خوبصورت تھے۔

نواب اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے خاموش ہیبت خان کو دیکھ رہی تھی۔اس نے کڑوں کو ایک نظر دیکھااوراس سے بڑی نرم و نازک مگر سہمی ہوئی آواز میں پوچھا،''خان یہ کون ہے؟''اس کا اشارہ اس عورت کی طرف تھا۔

وہ عورت کڑوں سے کھیلتے ہوئے بولی،''میں کون ہوں۔۔۔میں ہیبت خان کی بہن ہوں۔'' اور یہ کہہ کراس نے ہیبت خان کی طرف دیکھا جواس کے اس جواب پر سکڑ گیا تھا۔پھر وہ نواب سے مخاطب ہوئی،''میرا نام ہلاکت ہے۔''

نواب کچھ نہ سمجھی۔مگر وہ اس عورت کی آنکھوں سے خوف کھا رہی تھی جو یقیناً خوبصورت تھیں مگر بڑے خوفناک طور پر کھلی۔ان میں جیسے آگ برس رہی تھی۔

وہ آگے بڑھی اوراس نے سمٹی ہوئی،سہمی ہوئی نواب کی کلائیاں پکڑیں اوراس میں کڑے ڈالنے لگی۔لیکن اس نے اس کی کلائیاں چھوڑ دیں اور ہیبت خان سے مخاطب ہوئی،''تم جاؤ ہیبت خان۔۔۔میں اسے اچھی طرح سجا بنا کرتمہاری خدمت میں پیش کرنا چاہتی ہوں۔''ہیبت خان مبہوت تھا۔جب وہ نہ اٹھا تو وہ عورت جس نے اپنا نام ہلاکت بتایا تھا،ذرا تیزی سے بولی۔''جاؤ۔۔۔تم نے سنا نہیں؟''ہیبت خان،نواب کی طرف دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔وہ بہت مضطرب تھا۔اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جائے اور کیا کرے۔

مکان کے باہر جو برآمدہ سا تھا،اس کے ایک کونے میں ٹاٹ لگا باورچی خانہ تھا۔جب وہ اس کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ سردار آگ سلگا چکی ہے۔اس نے اس سے کوئی بات نہ کی

اور سرکنڈوں کے اس پار سڑک پر چلا گیا۔۔۔اس کی حالت نیم دیوانوں کی سی تھی۔ ذرا سی آہٹ پر بھی وہ چونک اٹھتا تھا۔ جب اس کو دور سے ایک لاری آتی ہوئی دکھائی دی تو اس نے سوچا کہ وہ اسے روک لے اور اس میں بیٹھ کر وہاں سے غائب ہو جائے۔ مگر جب وہ پاس آئی تو ایسی دھول اڑی کہ وہ اس میں غائب ہوگیا۔ اس نے آوازیں دیں، مگر گرد کے باعث اس کا حلق اس قابل ہی نہیں تھا کہ بلند آواز نکال سکے۔

گرد و غبار کم ہوا تو ہیبت خان نیم مردہ تھا۔۔۔اس نے چاہا کہ سرکنڈوں کے پیچھے اس مکان میں جائے جہاں اس نے کئی دن اور کئی راتیں نواب کے الہڑ پہلو میں گزاری تھیں، مگر وہ نہ جاسکا۔ اس کے قدم ہی نہیں اٹھتے تھے۔

وہ بہت دیر تک کچی سڑک پر کھڑا سوچتا رہا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ وہ عورت جو اس کے ساتھ آئی تھی، اس کے ساتھ اس کے کافی پرانے تعلقات تھے، صرف اس بنا پر کہ بہت دیر ہوئی، وہ اس کے خاوند کی موت کا افسوس کرنے گیا تھا جو اس کا لنگوٹیا تھا۔ مگر اتفاق سے یہ ماتم پرسی ان دونوں کے باہمی تعلق میں تبدیل ہوگئی۔ خاوند کی موت کے دوسرے ہی دن وہ اس کے گھر میں تھا، اور اس عورت نے اس کو ایسے تحکم سے اندر بلا کر اپنا آپ اس کے سپرد کیا تھا جیسے وہ اس کا نوکر ہے۔

ہیبت خان عورت کے معاملے میں بالکل کورا تھا۔ جب شاہینہ نے اس سے اپنے عجیب و غریب تحکم بھرے التفات کا اظہار کیا تو اس کے لیے یہی بڑی بات تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہینہ کے پاس بے اندازہ دولت تھی۔ کچھ اپنی اور کچھ اپنے مرحوم خاوند کی، مگر اسے اس دولت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کو شاہینہ سے صرف یہی دلچسپی تھی کہ وہ اس کی زندگی

کی سب سے پہلی عورت تھی۔ وہ اس کے تحکم کے نیچے شاید اس لیے دب کے رہ گیا تھا کہ وہ بالکل اناڑی تھا۔

بہت دیر تک وہ کچی سڑک پر کھڑا سوچتا رہا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔ سرکنڈوں کے پیچھے مکان کی طرف بڑھا تو اس نے برآمدے میں ٹاٹ لگے باورچی خانے میں سردار کو کچھ بھونتے ہوئے دیکھا۔ اندر اس کمرے کی طرف گیا جہاں نواڑ کا پلنگ تھا تو دروازہ بند پایا۔ اس نے ہولے سے دستک دی۔

چند لمحات کے بعد دروازہ کھلا۔ کچے فرش پر اس کو سب سے پہلے خون ہی خون نظر آیا۔ وہ کانپ اٹھا۔ پھر اس نے شاہینہ کو دیکھا جو دروازہ کے پٹ کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس نے ہیبت خان سے کہا،''میں نے تمہاری نواب کو سجا بنا دیا ہے!'' ہیبت خان نے اپنے خشک گلے کو تھوک سے کسی قدر تر کر کے اس سے پوچھا،''کہاں ہے؟'' شاہینہ نے جواب دیا۔'' کچھ تو اس پلنگ پر ہے۔۔۔لیکن اس کا بہترین حصہ باورچی خانہ میں ہے۔''

ہیبت خان پر اس کا مطلب سمجھے بغیر ہیبت طاری ہوگئی۔ وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ وہیں دہلیز کے پاس کھڑا رہا۔ مگر اس نے دیکھا کہ فرش پر گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی ہیں اور۔۔۔ ایک تیز چھری بھی پڑی ہے۔ اور نواڑی پلنگ پر کوئی لیٹا ہے جس پر خون آلود چادر پڑی ہے۔ شاہینہ نے مسکرا کر کہا،''چادر اٹھا کر دکھاؤں۔۔۔تمہاری سجی بنی نواب ہے۔۔۔میں نے اپنے ہاتھوں سے سنگھار کیا ہے۔۔۔لیکن تم پہلے کھانا کھالو۔ بہت بھوک لگی ہوگی، سردار بڑا لذیذ گوشت بھون رہی ہے۔ اس کی بوٹیاں میں نے خود اپنے ہاتھ سے کاٹی ہیں۔''

ہیبت خان کے پاؤں لڑکھڑائے۔۔۔زور سے چلایا،''شاہینہ تم نے یہ کیا کیا!''

شاہینہ مسکرائی۔ ''جان من! یہ پہلی مرتبہ نہیں۔۔۔ دوسری مرتبہ ہے۔ میرا خاوند، اللہ اسے جنت نصیب کرے، تمہاری طرح ہی بے وفا تھا۔ میں نے خود اس کو اپنے ہاتھوں سے مارا تھا اور اس کا گوشت پکا کر چیلوں اور کوؤں کو کھلایا تھا۔۔۔ تم سے مجھے پیار ہے، اس لیے میں نے تمہارے بجائے۔۔۔''

اس نے فقرہ مکمل نہ کیا اور پلنگ پر سے خون آلود چادر ہٹا دی۔۔۔ ہیبت خان کی چیخ اس کے حلق کے اندر ہی دھنسی رہی اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

جب اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ شاہینہ کار چلا رہی ہے اور وہ غیر علاقے میں ہیں۔

❁❁❁

موذیل

ترلوچن نے پہلی مرتبہ۔۔۔ چار برسوں میں پہلی مرتبہ رات کو آسمان دیکھا تھا اور وہ بھی اس لیے کہ اس کی طبیعت سخت گھبرائی ہوئی تھی اور وہ محض کھلی ہوا میں کچھ دیر سوچنے کے لیے اڈوانی چیمبرز کے ٹیرس پر چلا آیا تھا۔
آسمان بالکل صاف تھا۔ بادلوں سے بے نیاز،۔بہت بڑے خاکستری تنبو کی طرح ساری بمبئی پر تنا ہوا تھا۔حدِ نظر تک جگہ جگہ بتیاں روشن تھیں۔ترلوچن نے ایسا محسوس کیا تھا کہ آسمان سے بہت سارے ستارے جھڑ کر بلڈنگوں سے جو رات کے اندھیرے میں بڑے بڑے درخت معلوم ہوتی تھیں، اٹک گیے ہیں اور جگنوؤں کی طرح ٹمٹما رہے ہیں۔

ترلوچن کے لیے یہ بالکل ایک نیا تجربہ، ایک نئی کیفیت تھی۔۔۔رات کو کھلے آسمان کے نیچے ہونا۔اس نے محسوس کیا کہ وہ چار برس تک اپنے فلیٹ میں قید رہا اور قدرت کی ایک بہت بڑی نعمت سے محروم۔قریب قریب تین بجے تھے۔ہوا بے حد ہلکی پھلکی تھی۔ترلوچن پنکھے کی مکانکی ہوا کا عادی تھا جو اس کے سارے وجود کو بوجھل کر دیتی تھی۔صبح اٹھ کر وہ ہمیشہ یوں محسوس کرتا تھا، رات بھر اس کو مارا پیٹا گیا ہے۔ پر اب صبح کی قدرتی ہوا میں اس کے جسم کا رواں رواں، تر و تازگی چوس کر خوش ہو رہا تھا۔جب وہ اوپر آیا تھا تو اس کا دل و دماغ سخت

مضطرب اور ہیجان زدہ تھا۔لیکن آدھے گھنٹے ہی میں وہ اضطراب اور ہیجان جواس کو بہت تنگ کرر ہا تھا،کسی حد تک ٹھنڈا ہوگیا تھاوہ اب صاف طور پرسوچ سکتا تھا۔

کرپال کوراوراس کا سارا خاندان محلے میں تھا،جوکٹر مسلمانوں کا مرکز تھا۔ یہاں کئی مکانوں کو آگ لگ چکی تھی،کئی جانیں تلف ہو چکی تھیں۔ترلوچن ان سب کو لے آیا ہوتا مگر مصیبت یہ تھی کہ کرفیو نافذ ہوگیا تھااور وہ بھی نہ جانے کتنے گھنٹوں کا۔۔۔غالباً اڑتالیس گھنٹوں کا۔۔۔اور ترلوچن لازماً مغلوب تھا،آس پاس سب مسلمان تھے،بڑے خوفناک قسم کے مسلمان۔اور پنجاب سے دھڑادھڑ خبریں آرہی تھیں کہ وہاں سکھ مسلمانوں پر بہت ظلم ڈھا رہے ہیں۔کوئی بھی ہاتھ۔۔۔مسلمان ہاتھ بڑی آسانی سے نرم ونازک کرپال کور کی کلائی پکڑ کر موت کے کنوئیں کی طرف لے جاسکتا تھا۔

کرپال کی ماں اندھی تھی، باپ مفلوج۔بھائی تھا،وہ کچھ عرصے سے دیولالی میں تھا کہ اسے وہاں اپنے تازہ تازہ لیے ہوئے ٹھیکے کی دیکھ بھال کرنا تھی۔ترلوچن کو کرپال کے بھائی نرنجن پر بہت غصہ آتا تھا۔اس نے جوکہ ہر روز اخبار پڑھتا تھا،فسادات کی تیزی وتندی کے متعلق ہفتہ بھر پہلے آگاہ کردیا تھااور صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا۔نرنجن، یہ ٹھیکے ویکے ابھی رہنے دو۔ہم ایک بہت ہی نازک دور سے گزر رہے ہیں۔تمہاراا گر چہ رہنا بہت ضروری ہے۔اول تو یہاں سے اٹھ جاؤ،اور میرے یہاں چلے آؤ۔اس میں کوئی شک نہیں کہ جگہ کم ہےلیکن مصیبت کے دنوں میں آدمی کسی نہ کسی طرح گزارا کرلیا کرتا ہے۔۔۔مگر وہ نہ مانا۔ اس کا اتنا بڑا لیکچرسن کرصرف اپنی گھنی مونچھوں میں مسکرادیا”تم خواہ مخواہ فکر کرتے ہو۔۔۔میں نے یہاں ایسے کئی فساد دیکھے ہیں۔یہ امرتسر یالاہور نہیں بمبئی ہے،بمبئی۔تمہیں یہاں آئے

صرف چار برس ہوئے ہیں اور میں بارہ برس سے یہاں رہ رہا ہوں۔۔۔بارہ برس سے۔"
جانے نرنجن بمبئی کو کیا سمجھتا تھا۔اس کا خیال تھا کہ یہ ایسا شہر ہے، اگر فساد برپا بھی ہوں تو ان کا اثر خود زائل ہو جاتا ہے جیسے اس کے پاس چھومنتر ہے۔۔۔اوہ کہانیوں کا کوئی ایسا قلعہ ہے جس پر کوئی آفت نہیں آسکتی۔مگر ترلوچن صبح کی ٹھنڈی ہوا میں صاف دیکھ رہا تھا کہ۔۔۔محلہ بالکل محفوظ نہیں۔وہ تو صبح کے اخباروں میں یہ بھی پڑھنے کے لیے تیار تھا کہ کرپال کور اور اس کے ماں باپ قتل ہو چکے ہیں۔

اس کو کرپال کور کے مفلوج باپ اور اس کی اندھی ماں کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔وہ مر جاتے اور کرپال کور بچ جاتی تو ترلوچن کے لیے اچھا تھا۔۔۔وہاں دیولالی میں اس کا بھائی نرنجن بھی مارا جاتا تو وہ بھی اچھا تھا کہ ترلوچن کے لیے میدان صاف ہو جاتا۔خاص طور پر نرنجن اس کے راستے میں ایک روڑا ہی نہیں، بہت بڑا کھنگر تھا۔چنانچہ جب کبھی کرپال کور سے اس کی بات ہوتی تو وہ اسے نرنجن سنگھ کے بجائے کھنگر سنگھ کہتا۔
صبح کی ہوا دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی۔۔۔ترلوچن کا کیسوں سے بے نیاز سر بڑی خوشگوار ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا مگر اس کے اندر بے شمار اندیشے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا رہے تھے۔۔۔کرپال کور نئی نئی اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔وہ یوں تو ہٹے کٹے کنگھر سنگھ کی بہن تھی، مگر بہت ہی نرم و نازک لچکیلی تھی۔اس نے دیہات میں پرورش پائی تھی۔وہاں کی کئی گرمیاں سردیاں دیکھی تھیں مگر اس میں وہ سختی، وہ گٹھاؤ، وہ مردانہ پن نہیں تھا جو دیہات کی عام سکھ لڑکیوں میں ہوتا ہے جنھیں کڑی سے کڑی مشقت کرنی پڑتی ہے۔
اس کے نقش پتلے پتلے تھے، جیسے ابھی نامکمل ہیں۔چھوٹی چھوٹی چھاتیاں تھیں جن پر بالائیوں

کی چند اور تہیں چڑھنے کی ضرورت تھی۔ عام سکھ دیہاتی لڑکیوں کے مقابلے میں اس کا رنگ گورا تھا مگر کورے لٹھے کی طرح، اور بدن چکنا تھا جس طرح مرسی رائزڈ کپڑے کی سطح ہوتی ہے۔ بے حد شرمیلی تھی۔

ترلوچن اسی کے گاؤں کا تھا مگر زیادہ دیر وہاں رہا نہیں تھا۔ پرائمری سے نکل کر جب وہ شہر کے ہائی اسکول میں گیا تو بس پھر وہیں کا ہو کے رہ گیا۔ اسکول سے فارغ ہوا تو کالج کی تعلیم شروع ہوگئی۔ اس دوران میں وہ کئی مرتبہ۔۔۔ لاتعداد مرتبہ اپنے گاؤں گیا، مگر اس نے کرپال کور کے نام کی کسی لڑکی کا نام تک نہ سنا، شاید اس لیے کہ وہ ہر بار اس افراتفری میں رہتا تھا کہ جلد از جلد واپس شہر پہنچے۔

کالج کا زمانہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اڈوانی چیمبرز کے ٹیریس اور کالج کی عمارت میں غالباً دس برس کا فاصلہ تھا اور یہ فاصلہ ترلوچن کی زندگی کے عجیب وغریب واقعات سے پر تھا۔ برما، سنگاپور، ہانگ کانگ۔۔۔ پھر بمبئی، جہاں وہ چار برس سے مقیم تھا۔ ان چار برسوں میں اس نے پہلی مرتبہ رات کو آسمان کی شکل دیکھی تھی جو بری نہیں تھی۔۔۔ خاکستری رنگ کے تنبو کی چھت میں ہزار ہا دیے روشن تھے اور ہوا ٹھنڈی اور ہلکی پھلکی تھی۔

کرپال کور کا سوچتے سوچتے وہ موذیل کے متعلق سوچنے لگا۔ اس یہودی لڑکی کے بارے میں جو اڈوانی چیمبرز میں رہتی تھی۔ اس سے ترلوچن کو، گوڈے گوڈے عشق ہوگیا تھا۔ ایسا عشق جو اس نے اپنی پینتیس برس کی زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔

جس دن اس نے اڈوانی چیمبرز میں اپنے ایک عیسائی دوست کی معرفت دوسرے مالے پر فلیٹ لیا، اسی دن اس کی مڈبھیڑ موذیل سے ہوئی جو پہلی نظر دیکھنے پر اسے خوفناک طور پر

دیوانی معلوم ہوئی تھی۔ کٹے ہوئے بھورے بال اس کے سر پر پریشان تھے۔ بے حد پریشان۔ہونٹوں پرلپ اسٹک یوں جمی تھی جیسے گاڑھا خون اور وہ بھی جگہ جگہ سے چٹخی ہوئی تھی۔ڈھیلا ڈھالا لمبا سفید چغہ پہنے تھے جس کے کھلے گریبان سے اس کی نیل پڑی بڑی بڑی چھاتیاں تین چوتھائی کے قریب نظر آرہی تھیں۔ باہیں جو کہ ننگی تھیں،مہین مہین بالوں سے اٹی ہوئی تھیں جیسے وہ ابھی ابھی کسی سیلون سے بال کٹوا کے آئی ہے اور ان کی ننھی ننھی ہوائیاں ان پر جم گئی ہیں۔

ہونٹ اتنے موٹے نہیں تھے مگر گہرے عنابی رنگ کی لپ اسٹک کچھ اس انداز سے لگائی تھی کہ وہ موٹے اور بھینسے کے گوشت کے ٹکڑے معلوم ہوتے تھے۔

ترلوچن کا فلیٹ اس کے فلیٹ کے بالکل سامنے تھا۔بیچ میں ایک تنگ گلی تھی۔۔۔بہت ہی تنگ۔ جب ترلوچن اپنے فلیٹ میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا تو موذیل باہر نکلی۔کھڑاؤں پہنے تھی۔ترلوچن ان کی آواز سن کر رک گیا۔موذیل نے اپنے پریشان بالوں کی چقوں میں سے بڑی بڑی آنکھوں سے ترلوچن کی طرف دیکھا اور ہنسی۔۔۔ترلوچن بوکھلا گیا۔جیب سے چابی نکال کر وہ جلدی سے دروازے کی جانب بڑھا۔موذیل کی ایک کھڑاؤں سیمنٹ کے چکنے فرش پر پھسلی اور اس کے اوپر آرہی۔

جب ترلوچن سنبھلا تو موذیل اس کے اوپر تھی، کچھ اس طرح کہ اس کا لمبا چغہ اوپر چڑھ گیا تھا اور اس کی دو ننگی۔۔۔بڑی تگڑی ٹانگیں اس کے ادھر ادھر تھیں اور۔۔۔جب ترلوچن نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ بوکھلاہٹ میں کچھ اس طرح موذیل۔۔۔ساری موذیل سے الجھا جیسے وہ صابن کی طرح اس کے سارے بدن پر پھر گیا ہے۔

ترلوچن نے ہانپتے ہوئے مناسب وموزوں الفاظ میں سے اس معافی مانگی۔موزیل نے اپنالبادہ ٹھیک کیااور مسکرادی،''یہ کھڑاؤں ایک دم کنڈم چیز ہے۔''اور وہ اتری ہوئی کھڑاؤں میں اپناانگوٹھااوراس کی ساتھ والی انگلی پھنساتی کوری ڈور سے باہر چلی گئی۔
ترلوچن کاخیال تھا کہ موزیل سے دوستی پیدا کرناشاید مشکل ہولیکن وہ بہت ہی تھوڑے عرصے میں اس سے گھل مل گئی۔لیکن ایک بات تھی کہ وہ بہت خودسر تھی۔وہ ترلوچن کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔اس سے کھاتی تھی،اس سے پیتی تھی،اس کے ساتھ سینما جاتی تھی۔سارا سارا دن اس کے ساتھ جوہو پرنہاتی تھی لیکن جب وہ باھوں اور ہونٹوں سے کچھ اور آگے بڑھنا چاہتا تو وہ اسے ڈانٹ دیتی۔کچھ اس طور پر اسے گھرکتی کہ اس کے سارے ولولے اس کی داڑھی اور مونچھوں میں چکر کاٹتے رہ جاتے۔

ترلوچن کو پہلے کسی کے ساتھ محبت نہیں ہوئی تھی۔لاہور میں،برما میں،سنگاپور میں وہ لڑکیاں کچھ عرصے کے لیے خرید لیا کرتا تھا۔اس کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ بمبئی پہنچتے ہی وہ ایک نہایت الھڑ قسم کی یہودی لڑکی کے عشق میں''گوڈے گوڈے''دھنس جائے گا۔وہ اس سے کچھ عجیب قسم کی بے اعتنائی اور بے التفاتی برتتی تھی۔اس کے کہنے پر فوراً سج بن کر سینما جانے پر تیار ہو جاتی تھی مگر جب وہ اپنی سیٹ پر بیٹھتے تو ادھر ادھر نگاہیں دوڑانا شروع کردیتی۔کوئی اس کا شناسا نکل آتا تو زور سے ہاتھ ہلاتی اور ترلوچن سے اجازت لیے بغیر اس کے پہلو میں جابیٹھتی۔
ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔ترلوچن نے خاص طور پر موزیل کے لیے پرتکلف کھانے منگوائے ہیں، مگر اس کو کوئی اپنا پرانا دوست نظر آگیا ہے اور وہ نوالہ چھوڑ کر اس کے پاس جا بیٹھی ہے اور

ترلوچن کے سینے پر مونگ دل رہی ہے۔

ترلوچن بعض اوقات بھنا جاتا تھا کیونکہ وہ اسے قطعی طور پر چھوڑ کر اپنے ان پرانے دوستوں اور شناساؤں کے ساتھ چلی جاتی تھی اور کئی کئی دن اس سے ملاقات نہ کرتی تھی۔ کبھی سر درد کا بہانہ، کبھی پیٹ کی خرابی کا جس کے متعلق ترلوچن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ فولاد کی طرح سخت ہے اور کبھی خراب نہیں ہوسکتا۔
جب اس سے ملاقات ہوتی تو وہ اس سے کہتی ''تم سکھ ہو۔۔۔ یہ نازک باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتیں۔''

ترلوچن جل بھن جاتا اور پوچھتا ''کون سی نازک باتیں۔۔۔تمہارے پرانے یاروں کی؟''
موذیل دونوں ہاتھ اپنے چوڑے چکلے کولہوں پر لٹکا کر اپنی تگڑی ٹانگیں چوڑی کر دیتی اور کہتی ''یہ تم مجھے ان کے طعنے کیا دیتے ہو۔۔۔ ہاں وہ میرے یار ہیں۔۔۔اور مجھے اچھے لگتے ہیں۔تم جلتے ہو تو جلتے رہو۔''

ترلوچن بڑے وکیلانہ انداز میں پوچھتا ''اس طرح تمہاری میری کس طرح نبھے گی؟''
موذیل زور کا قہقہہ لگاتی ''تم سچ مچ سِکھ ہو۔۔۔ایڈیٹ، تم سے کس نے کہا ہے کہ میرے ساتھ نبھاؤ۔۔۔اگر نبھانے کی بات ہے تو جاؤ اپنے وطن میں کسی سکھنی سے شادی کرلو۔۔۔میرے ساتھ تو اسی طرح چلے گا۔''

ترلوچن نرم ہو جاتا۔ دراصل موذیل اس کی زبردست کمزوری بن گئی تھی۔ وہ ہر حالت میں اس کی قربت کا خواہش مند تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موذیل کی وجہ سے اس کی اکثر توہین

ہوتی تھی۔معمولی معمولی کرسٹان لونڈوں کے سامنے جن کی کوئی حقیقت ہی نہیں تھی،اسے خفیف ہونا پڑتا تھا۔مگر دل سے مجبور ہو کر اس نے یہ سب کچھ برداشت کرنے کا تہیہ کرلیا تھا۔
عام طور پر توہین اور ہتک کا ردعمل انتقام ہوتا ہے مگر ترلوچن کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ اس نے اپنے دل و دماغ کی بہت سی آنکھیں میچ لی تھیں اور کئی کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی۔اس کو موذیل پسند تھی۔۔۔پسند ہی نہیں جیسا کہ وہ اکثر اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا، ''گوڈے گوڈے''اس کے عشق میں دھنس گیا تھا۔اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا،اس کے جسم کا جتنا حصہ باقی رہ گیا ہے وہ بھی اس عشق کی دلدل میں چلا جائے اور قصہ ختم ہو۔

دو برس تک وہ اسی طرح خوار ہوتا رہا لیکن ثابت قدم رہا۔آخر ایک روز جب کہ موذیل موج میں تھی،اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر پوچھا''موذیل۔۔۔کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو۔'' موذیل اس کے بازوؤں سے جدا ہوگئی اور کرسی پر بیٹھ کر اپنے فراک کا گھیرا دیکھنے لگی۔پھر اس نے اپنی موٹی موٹی یہودی آنکھیں اٹھائیں اور گھنی پلکیں جھپکا کر کہا''میں سکھ سے محبت نہیں کرسکتی۔''
ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ پگڑی کے نیچے اس کے کیسوں میں کسی نے دہکتی ہوئی چنگاریاں رکھ دی ہیں۔اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی''موذیل! تم ہمیشہ میرا مذاق اڑاتی ہو۔۔۔یہ میرا مذاق نہیں،میری محبت کا مذاق ہے۔''

موذیل اٹھی اور اس نے اپنے بھورے ترشے ہوئے بالوں کو ایک دلفریب جھٹکا دیا''تم شیو کرا لو اور اپنے سر کے بال کھلے چھوڑ دو۔۔۔تو میں شرط لگاتی ہوں کئی لونڈے تمہیں آنکھ ماریں گے۔۔۔تم خوبصورت ہو۔''

ترلوچن کے کیسوں میں مزید چنگاریاں پڑ گئیں۔اس نے آگے بڑھ کر زور سے موذیل کو اپنی طرف گھسیٹا اور اس کے عنابی ہونٹوں میں اپنے مونچھوں بھرے ہونٹ پیوست کردیے۔موذیل نے ایک دم ''پھوں پھوں'' کی اوراس کی گرفت سے علیحدہ ہوگئی۔

''میں صبح اپنے دانتوں پر برش کر چکی ہوں۔۔۔تم تکلیف نہ کرو۔''

ترلوچن چلایا''موذیل۔''

موذیل وینٹی بیگ سے ننھا سا آئینہ نکال کر اپنے ہونٹ دیکھنے لگی جس پر لگی ہوئی گاڑھی لپ اسٹک پر خراشیں آگئی تھیں۔''خدا کی قسم۔۔۔تم اپنی داڑھی اورمونچھوں کا صحیح استعمال نہیں کرتے۔۔۔ان کے بال ایسے اچھے ہیں کہ میرا نیوی بلو سکرٹ بہت اچھی طرح صاف کر سکتے ہیں۔۔۔بس تھوڑا سا پٹرول لگانے کی ضرورت ہوگی۔''

ترلوچن غصے کی اس انتہا تک پہنچ چکا تھا جہاں وہ بالکل ٹھنڈا ہوگیا تھا۔آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔موذیل بھی آگئی اوراس نے ترلوچن کی داڑھی کھولنی شروع کردی۔۔۔اس میں جو پنیں لگی تھیں،وہ اس نے ایک ایک کرکے اپنے دانتوں تلے دبالیں۔

ترلوچن خوبصورت تھا۔جب اس کے داڑھی مونچھ نہیں اگی تھی تو واقعی لوگ اس کو کھلے کیسوں کے ساتھ دیکھ کر دھوکا کھا جاتے تھے کہ وہ کوئی کم عمر خوبصورت لڑکی ہے۔مگر بالوں کے اس انبار نے اب اس کے تمام خدوخال جھاڑیوں کے مانند اندر چھپا لیے تھے۔اس کو اس کا احساس تھا۔مگر وہ ایک اطاعت شعار اورفرماں بردارلڑکا تھا۔اس کے دل میں مذہب کا احترام تھا۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان چیزوں کو اپنے وجود سے الگ کردے جن سے اس کے

مذہب کی ظاہری تکمیل ہوتی تھی۔
جب داڑھی پوری کھل گئی اور اس کے سینے پر لٹکنے لگی تو اس نے موذیل سے پوچھا،''یہ تم کیا کر رہی ہو؟''

دانتوں میں پنیں دبائے وہ مسکرائی،''تمہارے بال بہت ملائم ہیں ۔۔۔میرا اندازہ غلط تھا کہ ان سے میرا نیوی بلو سکرٹ صاف ہو سکے گا۔ترلوچن تم یہ مجھے دے دو۔میں انھیں گوندھ کر اپنے لیے ایک فسٹ کلاس بٹوا بناؤں گی۔''
اب ترلوچن کی داڑھی میں چنگاریاں بھڑکنے لگی۔وہ بڑی سنجیدگی سے موذیل سے مخاطب ہوا، ''میں نے آج تک تمہارے مذہب کا مذاق نہیں اڑایا۔۔تم کیوں اڑاتی ہو۔۔۔دیکھو کسی کے مذہبی جذبات سے کھیلنا اچھا نہیں ہوتا۔۔۔میں یہ کبھی برداشت نہ کرتا۔مگر صرف اس لیے کرتا رہا ہوں کہ مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے۔۔۔کیا تمہیں اس کا پتہ نہیں۔''موذیل نے ترلوچن کی داڑھی سے کھیلنا بند کر دیا،''مجھے معلوم ہے۔''

''پھر۔'' ترلوچن نے اپنی داڑھی کے بال بڑی صفائی سے تہ کیے اور موذیل کے دانتوں سے پنیں نکال لیں،''تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میری محبت بکواس نہیں ۔۔۔میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''
''مجھے معلوم ہے۔'' بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر وہ اٹھی اور دیوار سے لٹکی ہوئی تصویر کی طرف دیکھنے لگی،''میں بھی قریب قریب یہی فیصلہ کر چکی ہوں کہ تم سے شادی کروں گی۔''

ترلوچن اچھل پڑا،''سچ!''

موذیل کے عنابی ہونٹ بڑی موٹی مسکراہٹ کے ساتھ کھلے اور اس کے سفید مضبوط دانت ایک لحظے کے لیے چمکے۔ ''ہاں!'' ترلوچن نے اپنی نصف لپٹی ہوئی داڑھی ہی سے اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ ''تو۔۔۔تو کب؟'' موذیل الگ ہٹ گئی۔ ''جب۔۔۔تم اپنے یہ بال کٹوا دو گے!'' ترلوچن اس وقت 'جو ہو سو ہو' بنا تھا۔ اس نے کچھ نہ سوچا اور کہہ دیا، ''میں کل ہی کٹوا دوں گا۔'' موذیل فرش پر ٹیپ ڈانس کرنے لگی۔ ''تم بکواس کرتے ہوئے ترلوچن۔۔۔ تم میں اتنی ہمت نہیں ہے۔'' اس نے ترلوچن کے دل و دماغ سے مذہب کے رہے سہے خیال کو نکال باہر پھینکا۔

''تم دیکھ لو گی۔''

''دیکھ لوں گی۔'' اور وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ ترلوچن کی مونچھوں کو چوما اور ''پھوں پھوں'' کرتی باہر نکل گئی۔

ترلوچن نے رات بھر کیا سوچا۔۔۔ وہ کن کن اذیتوں سے گزرا، اس کا تذکرہ فضول ہے، اس لیے کہ دوسرے روز اس نے فورٹ میں اپنے کیس کٹوا دیے اور داڑھی بھی منڈوا دی۔۔۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا اور وہ آنکھیں میچے رہا۔ جب سارا معاملہ صاف ہو گیا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور دیر تک اپنی شکل آئینے میں دیکھتا رہا جس پر بمبئی کی حسین سے حسین لڑکی بھی کچھ دیر کے لیے غور کرنے پر مجبور ہو جاتی۔
ترلوچن وہی عجیب و غریب ٹھنڈک محسوس کرنے لگا تھا جو سیلون سے باہر نکل کر اس کو لگی تھی۔ اس نے ٹیریس پر تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ جہاں ٹینکوں اور نلوں کا ایک ہجوم تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس داستان کا بقایا حصہ اس کے دماغ میں نہ آئے۔ مگر وہ آئے بن نہ رہا۔

بال کٹوا کر وہ پہلے دن گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اس نے اپنے نوکر کے ہاتھ دوسرے روز چٹ موذیل کو بھیجی کہ اس کی طبیعت ناساز ہے، تھوڑی دیر کے لیے آجائے۔ موذیل آئی۔ ترلوچن کو بالوں کے بغیر دیکھ کر پہلے وہ ایک لحظے کے لیے ٹھٹکی۔ پھر ''مائی ڈارلنگ ترلوچن'' کہہ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی اور اس کا سارا چہرہ عنابی کر دیا۔

اس نے ترلوچن کے صاف اور ملائم گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے چھوٹے انگریزی وضع کے کٹے ہوئے بالوں میں اپنی کنگھی کی اور عربی زبان میں نعرے مارتی رہی۔ اس نے اس قدر شور مچایا کہ اس کی ناک سے پانی بہنے لگا۔۔۔ موذیل نے جب اسے محسوس کیا تو اپنی سکرٹ کا گھیرا اٹھایا اور اسے پونچھنا شروع کر دیا۔۔۔ ترلوچن شرما گیا۔ اس نے سکرٹ نیچی کی اور سرزنش کے طور پر اس سے کہا، ''نیچے کچھ پہن تو لیا کرو۔''

موذیل پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ باسی اور جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی لپ اسٹک لگے ہونٹوں سے مسکرا کر اس نے صرف اتنا ہی کہا، ''مجھے بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے۔۔۔ ایسے ہی چلتا ہے۔''

ترلوچن کو وہ پہلا دن یاد آگیا۔ جب وہ اور موذیل دونوں ٹکرا گیے تھے اور آپس میں کچھ عجیب طرح گڈ مڈ ہو گیے تھے۔ مسکرا کر اس نے موذیل کو اپنے سینے کے ساتھ لگایا، ''شادی کل ہو گی!''

''ضرور۔'' موذیل نے ترلوچن کی ملائم ٹھوڑی پر اپنے ہاتھ کی پشت پھیری۔

طے یہ ہوا کہ شادی پونے میں ہو۔ چونکہ سول میرج تھی اس لیے ان کو دس پندرہ دن کا نوٹس دینا تھا۔ عدالتی کارروائی تھی۔ اس لیے مناسب یہی خیال کیا گیا کہ پونا بہتر ہے۔ پاس ہے

اورترلوچن کے وہاں کئی دوست بھی ہیں۔ دوسرے روز انھیں پروگرام کے مطابق پونا روانہ ہوجانا تھا۔

موذیل، فورٹ کے ایک اسٹور میں سیلز گرل تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ٹیکسی اسٹینڈ تھا۔ بس یہیں موذیل نے اس کو انتظار کرنے کے لیے کہا تھا۔۔۔ترلوچن وقت مقررہ پر وہاں پہنچا۔ ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آئی۔ دوسرے روز اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے ایک پرانے دوست کے ساتھ جس نے تازہ تازہ موٹر خریدی ہے، دیولالی چلی گئی ہے اور ایک غیر معین عرصے کے لیے وہیں رہے گی۔
ترلوچن پر کیا گزری۔۔۔؟ یہ ایک بڑی لمبی کہانی ہے۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ اس نے جی کڑا کیا اور اس کو بھول گیا۔۔۔ اتنے میں اس کی ملاقات کرپال کور سے ہوگئی اور وہ اس سے محبت کرنے لگا اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے محسوس کیا کہ موذیل بہت واہیات لڑکی تھی جس کے دل کے ساتھ پتھر لگے ہوئے تھے اور جو چڑوں کے مانند ایک جگہ سے دوسری جگہ پھدکتا رہتا تھا۔ اس احساس سے اس کو ایک گونہ تسکین ہوئی تھی کہ وہ موذیل سے شادی کرنے کی غلطی نہ کربیٹھا تھا۔

لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی موذیل کی یاد ایک چٹکی کے مانند اس کے دل کو پکڑ لیتی تھی اور پھر چھوڑ کر کدکڑے لگاتی غائب ہوجاتی تھی۔۔۔ وہ بے حیا تھی۔۔۔ بے مروت تھی، اس کو کسی کے جذبات کا پاس نہیں تھا، پھر بھی وہ ترلوچن کو پسند تھی۔ اس لیے کبھی کبھی وہ اس کے متعلق سوچنے پر مجبور ہوجاتا تھا کہ وہ دیولالی میں اتنے عرصے سے کیا کررہی ہے۔ اسی آدمی کے ساتھ ہے جس نے نئی نئی کار خریدی تھی یا اسے چھوڑ کر کسی اور کے پاس چلی گئی ہے۔ اس کو

اس خیال سے سخت کوفت ہوتی تھی کہ وہ اس کے سوا کسی اور کے پاس ہوگی۔ حالانکہ اس کو موذیل کے کردار کا بخوبی علم تھا۔
وہ اس پر سیکڑوں نہیں ہزاروں روپے خرچ کر چکا تھا، لیکن اپنی مرضی سے۔ ورنہ موذیل مہنگی نہیں تھی۔ اس کو بہت سستی قسم کی چیزیں پسند آتی تھیں۔ ایک مرتبہ ترلوچن نے اسے سونے کے ٹوپس دینے کا ارادہ کیا جو اسے بہت پسند تھے، مگر اسی دکان میں موذیل جھوٹے اور بھڑکیلے اور بہت سستے آویزوں پر مرمٹی اور سونے کے ٹوپس چھوڑ کر ترلوچن سے منتیں کرنے لگی کہ وہ انھیں خرید دے۔

ترلوچن اب تک نہ سمجھ سکا کہ موذیل کس قماش کی لڑکی ہے۔ کس آب و گل سے بنی ہے۔ وہ گھنٹوں اس کے ساتھ لیٹی رہتی تھی۔ اس کو چومنے کی اجازت دیتی تھی۔ وہ سارا کا سارا صابن کی مانند اس کے جسم پر پھر جاتا تھا۔ مگر وہ اس کو اس سے آگے ایک انچ بڑھنے نہیں دیتی تھی۔ اس کو چڑانے کی خاطر اتنا کہہ دیتی تھی، ''تم سکھ ہو۔۔۔ مجھے تم سے نفرت ہے!''
ترلوچن اچھی طرح محسوس کرتا تھا کہ موذیل کو اس سے نفرت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس سے کبھی نہ ملتی۔ برداشت کا مادہ اس میں رتی بھر بھی نہیں تھا۔ وہ کبھی دو برس تک اس کی صحبت میں نہ گزارتی۔ دوٹوک فیصلہ کر دیتی۔ انڈرویئر اس کو ناپسند تھے۔ اس لیے کہ ان سے اس کو الجھن ہوتی تھی۔ ترلوچن نے کئی بار اس کو ان کی اشد ضرورت سے آگاہ کیا۔ اس کو شرم و حیا کا واسطہ دیا، مگر اس نے یہ چیز کبھی نہ پہنی۔

ترلوچن جب اس سے حیا کی بات کرتا تھا وہ چڑ جاتی تھی، ''یہ حیا ویا کیا بکواس ہے۔۔۔ اگر تمہیں اس کا کچھ خیال ہے تو آنکھیں بند کرلیا کرو۔۔۔ تم مجھے یہ بتاؤ کون سا لباس ہے جس میں

آدمی ننگا نہیں ہوسکتا۔۔۔ یا جس میں سے تمہاری نگاہیں پار نہیں ہوسکتیں۔۔۔ مجھ سے ایسی بکواس نہ کیا کرو۔۔۔ تم سکھ ہو۔۔۔ مجھے معلوم ہے کہ تم پتلون کے نیچے ایک سلکی سا انڈر ویئر پہنتے ہو جو نیکر سے ملتا جلتا ہے۔۔۔ یہ بھی تمہاری داڑھی اور سر کے بالوں کی طرح مذہب میں شامل ہے۔۔۔ شرم آنی چاہیے تمہیں۔ اتنے بڑے ہوگیے ہو اور ابھی تک یہی سمجھتے ہو کہ تمہارا مذہب انڈر ویئر میں چھپا بیٹھا ہے!''

ترلوچن کو شروع شروع میں ایسی باتیں سن کر غصہ آیا تھا۔ مگر بعد میں غور وفکر کرنے پر وہ کبھی کبھی لڑھک جاتا تھا اور سوچتا تھا کہ موذیل کی باتیں شاید نادرست نہیں اور جب اس نے اپنے کیسوں اور داڑھی کا صفایا کرادیا تو اسے قطعی طور پر ایسا محسوس ہوا کہ وہ بیکار اتنے دن بالوں کا اتنا بوجھ اٹھائے اٹھائے پھرا جس کا کچھ مطلب ہی نہیں تھا۔

پانی کی ٹنکی کے پاس پہنچ کر ترلوچن رک گیا۔ موذیل کو ایک بڑی موٹی گالی دے کر اس نے اس کے متعلق سوچنا بند کردیا۔۔۔ کرپال کور۔۔۔ ایک پاکیزہ لڑکی، جس سے اس کو محبت ہوئی تھی، خطرے میں تھی۔ وہ ایسے محلے میں تھی جس میں کٹر قسم کے مسلمان رہتے تھے اور وہاں دو تین واردات بھی ہو چکی تھیں۔۔۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس محلے میں اڑتالیس گھنٹے کا کرفیو تھا۔ مگر کرفیو کی کون پروا کرتا ہے۔ اس چالی کے مسلمان ہی اگر چاہتے تو اندر ہی اندر کرپال کور، اس کی ماں اور اس کے باپ کا بڑی آسانی کے ساتھ صفایا کرسکتے تھے۔

ترلوچن سوچتا سوچتا پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گیا۔ اس کے سر کے بال اب کافی لمبے ہوگیے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ ایک برس کے اندر اندر یہ پورے کیسوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ اس کی داڑھی تیزی سے بڑھی تھی مگر وہ اسے بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ فورٹ میں ایک باربر تھا،

وہ اس صفائی سے اسے تراشتا تھا کہ ترشی ہوئی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اس نے اپنے لمبے اور ملائم بالوں میں انگلیاں پھیریں اور ایک سرد آہ بھری۔۔۔اٹھنے کا ارادہ ہی کررہا تھا کہ اسے کھڑاؤں کی کرخت آواز سنائی دی، اس نے سوچا کون ہوسکتا ہے۔۔۔؟ بلڈنگ میں کئی یہودی عورتیں تھیں جو سب کی سب گھر میں کھڑاؤں پہنتی تھیں۔۔۔ آواز قریب آتی گئی۔یکلخت اس نے دوسری ٹنکی کے پاس موذیل کو دیکھا، جو یہودیوں کی خاص قطع کا ڈھیلا ڈھالا لمبا کرتا پہنے بڑے زور کی انگڑائی لے رہی تھی۔۔۔اس زور کی کہ ترلوچن کو محسوس ہوا اس کے آس پاس کی ہوا چٹخ جائے گی۔
ترلوچن، پانی کے نل پر سے اٹھا۔اس نے سوچا"یہ ایکا ایکی کہاں سے نمودار ہوگئی۔۔۔اور اس وقت ٹیرس پر کیا کرنے آئی ہے؟" موذیل نے ایک اور انگڑائی لی۔۔۔اب ترلوچن کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔

ڈھیلے ڈھالے کرتے میں اس کی مضبوط چھاتیاں دھڑکیں۔۔۔ترلوچن کی آنکھوں کے سامنے کئی گول گول اور چپٹے چپٹے نیل ابھر آئے۔وہ زور سے کھانسا۔موذیل نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔اس کا ردعمل بالکل خفیف تھا۔کھڑاؤں گھسٹتی وہ اس کے پاس آئی اور اس کی ننھی منی داڑھی دیکھنے لگی، "تم پھر سکھ بن گئے ترلوچن؟"
داڑھی کے بال ترلوچن کو چبھنے لگے۔

موذیل نے آگے بڑھ کر اس کی ٹھوڑی کے ساتھ اپنے ہاتھ کی پشت رگڑی اور مسکرا کر کہا، "اب یہ برش اس قابل ہے کہ میری نیو بلو سکرٹ صاف کر سکے۔۔۔مگر وہ تو وہیں دیولالی میں

رہ گئی ہے۔“

ترلوچن خاموش رہا۔موذیل نے اس کے بازو کی چٹکی لی،”بولتے کیوں نہیں سردار صاحب؟“

ترلوچن اپنی پچھلی بیوقوفیوں کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔تاہم اس نے صبح کے ملگجے اندھیرے میں موذیل کے چہرے کو غور سے دیکھا۔۔کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ایک صرف وہ پہلے سے کچھ کمزور نظر آتی تھی۔ترلوچن نے اس سے پوچھا،”بیمار رہی ہو؟“

”نہیں۔“موذیل نے اپنے ترشے ہوئے بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔

”پہلے سے کمزور دکھائی دیتی ہو؟“

”میں ڈائٹنگ کر رہی ہوں۔“موذیل پانی کے موٹے نل پر بیٹھ گئی اور کھڑاؤں فرش کے ساتھ بجانے لگی۔”تم گویا کہ۔۔۔اب پھر۔۔۔نئے سرے سے سکھ بن رہے ہو۔“

ترلوچن نے کسی قدر ڈھٹائی کے ساتھ کہا،”ہاں!“

”مبارک ہو۔“موذیل نے ایک کھڑاؤں پیر سے اتار لی اور پانی کے نل پر بجانے لگی۔”کسی اور لڑکی سے محبت کرنی شروع کی؟“

ترلوچن نے آہستہ سے کہا،”ہاں!“

”مبارک ہو۔۔۔اسی بلڈنگ کی ہے کوئی؟“

”نہیں۔۔۔“

’’یہ بہت بری بات ہے۔‘‘ موذیل کھڑاؤں اپنی انگلیوں میں اڑس کر اٹھی، ’’ہمیشہ آدمی کو اپنے ہمسایوں کا خیال رکھنا چاہیے۔‘‘

ترلوچن خاموش رہا۔موذیل نے اٹھ کراس کی داڑھی کو اپنی پانچوں انگلیوں سے چھیڑا، ’’کیا اسی لڑکی نے تمہیں یہ بال بڑھانے کا مشورہ دیا ہے؟‘‘
’’نہیں۔‘‘

ترلوچن بڑی الجھن محسوس کر رہا تھا جیسے کنگھا کرتے کرتے اس کی داڑھی کے بال آپس میں الجھ گیے ہیں۔جب اس نے’’نہیں‘‘ کہا تو اس کے لہجے میں تیکھا پن تھا۔
موذیل کے ہونٹوں پر لپ اسٹک باسی گوشت کی طرح معلوم ہوتی تھی۔وہ مسکرائی تو ترلوچن نے ایسا محسوس کیا کہ اس کے گاؤں میں جھٹکے کی دکان پر قصائی نے چھری سے موٹی رگ کے گوشت کے دوٹکڑے کر دیے ہیں۔مسکرانے کے بعد وہ ہنسی ’’تم اب یہ داڑھی منڈا ڈالو تو کسی کی بھی قسم لے لو، میں تم سے شادی کرلوں گی۔‘‘

ترلوچن کے جی میں آئی کہ اس سے کہے کہ وہ ایک بڑی شریف، باعصمت اور پاک طینت کنواری لڑکی سے محبت کر رہا ہے اوراسی سے شادی کرے گا۔۔موذیل اس کے مقابلے میں فاحشہ ہے، بدصورت ہے، بے وفا ہے، بے مروت ہے مگر وہ اس قسم کا گھٹیا آدمی نہیں تھا۔ اس نے موذیل سے صرف اتنا کہا ’’موذیل! میں اپنی شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔میرے گاؤں کی ایک سیدھی سادی لڑکی ہے۔۔۔جو مذہب کی پابند ہے۔اسی کے لیے میں نے بال بڑھانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔‘‘

موذیل سوچ بچار کی عادی نہیں تھی، لیکن اس نے کچھ دیر سوچا اور کھڑاؤں پر نصف دائرے میں گھوم کر ترلوچن سے کہا، ''وہ مذہب کی پابند ہے تو تمہیں کیسے قبول کرے گی؟ کیا اسے معلوم نہیں کہ تم ایک دفعہ اپنے بال کٹوا چکے ہو؟''

''اس کو ابھی تک معلوم نہیں۔۔۔داڑھی میں نے تمہارے دیولالی جانے کے بعد ہی بڑھانی شروع کر دی تھی۔۔۔محض انتقامی طور پر۔۔۔اس کے بعد میری کرپال کور سے ملاقات ہوئی۔ مگر میں پگڑی اس طریقے سے باندھتا ہوں کہ سو میں سے ایک ہی آدمی مشکل سے جان سکتا ہے کہ میرے کیس کٹے ہوئے ہیں۔۔۔مگر اب یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔''
ترلوچن نے اپنے لمبے ملائم بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنا شروع کی۔
موذیل نے لمبا کرتہ اٹھا کر اپنی گوری دبیز ران کھجلانی شروع کی، ''یہ بہت اچھا ہے۔۔۔مگر یہ کم بخت مچھر یہاں بھی موجود ہے۔۔۔دیکھو کس زور سے کاٹا ہے۔''

ترلوچن نے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ موذیل نے اس جگہ جہاں مچھر نے کاٹا تھا، انگلی سے لب لگائی اور کرتہ چھوڑ کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ ''کب ہو رہی ہے تمہاری شادی؟''
''ابھی کچھ پتہ نہیں۔'' یہ کہہ کر ترلوچن سخت متفکر ہو گیا۔

چند لمحات تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد موذیل نے اس کے تفکر کا اندازہ لگا کر اس سے بڑے سنجیدہ انداز میں پوچھا، ''ترلوچن! تم کیا سوچ رہے ہو؟''
ترلوچن کو اس وقت کسی ہمدرد کی ضرورت تھی۔ خواہ وہ موذیل ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ اس نے اس کو سارا ماجرا سنا دیا۔ موذیل ہنسی، ''تم اول درجے کے ایڈیٹ ہو۔۔۔جاؤ اس کو لے آؤ۔

ایسی کیا مشکل ہے؟"

"مشکل! موذیل، تم اس معاملے کی نزاکت کو کبھی نہیں سمجھ سکتیں۔۔۔کسی بھی معاملے کی نزاکت۔۔۔تم ایک لا ابالی قسم کی لڑکی ہو۔۔۔یہی وجہ ہے کہ تمہارے اور میرے تعلقات قائم نہیں رہ سکے، جس کا مجھے ساری عمر افسوس رہے گا۔"
موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں پانی کے نل کے ساتھ ماری۔"افسوس بی ڈیمڈ۔۔۔سلی ایڈیٹ۔۔۔تم یہ سوچو کہ تمہاری اس۔۔۔کیا نام ہے اس کا۔۔۔اس محلے سے بچا کر لانا کیسے ہے۔۔۔تم بیٹھ گیے ہو تعلقات کا رونا رونے۔۔۔تمہارے میرے تعلقات کبھی قائم نہیں رہ سکتے تھے۔۔۔تم ایک سِلی قسم کے آدمی ہو۔۔۔اور بہت ڈرپوک۔مجھے نڈر مرد چاہیے۔۔۔لیکن چھوڑو ان باتوں کو۔۔۔چلو آؤ، تمہاری اس کور کو لے آئیں!"

اس نے ترلوچن کا بازو پکڑلیا۔۔ترلوچن نے گھبراہٹ میں اس سے پوچھا"کہاں سے؟"
"وہیں سے، جہاں وہ ہے۔۔۔میں اس محلے کی ایک ایک اینٹ کو جانتی ہوں۔۔۔چلو آؤ میرے ساتھ۔"

"مگر سنو تو۔۔۔کرفیو ہے۔"
"موذیل کے لیے نہیں۔۔۔چلو آؤ۔"

وہ ترلوچن کو بازو سے پکڑ کر کھینچتی اس دروازے تک لے گئی تھی جو نیچے سیڑھیوں کی طرح کھلتا تھا۔دروازہ کھول کر وہ اترنے والی تھی کہ رک گئی اور ترلوچن کی داڑھی کی طرف دیکھنے لگی۔
ترلوچن نے پوچھا"کیا بات ہے؟"

موذیل نے کہا،’’یہ تمہاری داڑھی ۔۔۔لیکن خیر ٹھیک ہے ۔اتنی بڑی نہیں ہے ۔۔۔ننگے سر چلو گے تو کوئی نہیں سمجھے گا کہ تم سکھ ہو۔‘‘
’’ننگے سر!‘‘ ترلوچن نے کسی قدر بوکھلا کر کہا،’’میں ننگے سر نہیں جاؤں گا۔‘‘

موذیل نے بڑے معصوم انداز میں پوچھا،’’کیوں؟‘‘
ترلوچن نے اپنے بالوں کی ایک لٹ ٹھیک کی۔’’تم سمجھتی نہیں ہو۔میرا وہاں پگڑی کے بغیر جانا ٹھیک نہیں۔‘‘

’’کیوں ٹھیک نہیں۔‘‘
’’تم سمجھتی کیوں نہیں ہو کہ اس نے مجھے ابھی تک ننگے سر نہیں دیکھا۔۔۔وہ یہی سمجھتی ہے کہ میرے کیس ہیں۔میں اس پر یہ راز افشا نہیں کرنا چاہتا۔‘‘

موذیل نے زور سے اپنی کھڑاؤں دروازے کی دہلیز پر ماری،’’تم واقعی اول درجے کے ایڈیٹ ہو۔۔۔گدھے کہیں کے۔۔۔اس کی جان کا سوال ہے۔۔۔کیا نام ہے،تمہاری اس کور کا،جس سے تم محبت کرتے ہو۔‘‘
ترلوچن نے اسے سمجھانے کی کوشش کی،’’موذیل،وہ بڑی مذہبی قسم کی لڑکی ہے۔۔۔اگر اس نے مجھے ننگے سر دیکھ لیا تو مجھ سے نفرت کرنے لگے گی۔‘‘

موذیل چڑ گئی،’’اوہ،تمہاری محبت بی ڈیمڈ۔۔۔میں پوچھتی ہوں۔کیا سارے سکھ تمہارے طرح کے بے وقوف ہوتے ہیں۔۔۔اس کی جان کو خطرہ ہے اور تم کہتے ہو کہ پگڑی ضرور پہنو گے۔۔۔اور شاید وہ اپنا انڈر ویئر بھی جو نیکر سے ملتا جلتا ہے۔‘‘

ترلوچن نے کہا،"وہ تو میں ہر وقت پہنے ہوتا ہوں۔"

"بہت اچھا کرتے ہو۔۔۔مگر اب تم یہ سوچو کہ معاملہ اس محلے کا ہے جہاں میاں بھائی ہی میاں بھائی رہتے ہیں اور وہ بھی بڑے بڑے دادا اور بڑے بڑے موالی۔۔۔تم پگڑی پہن کر گئے تو وہیں ذبح کر دیے جاؤ گے۔"
ترلوچن نے مختصر سا جواب دیا،"مجھے اس کی پروا نہیں۔۔۔اگر میں تمہارے ساتھ وہاں جاؤں گا تو پگڑی پہن کر جاؤں گا۔۔۔میں اپنی محبت خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا!"

موذیل جھنجھلا گئی۔اس زور سے اس نے پیچ وتاپ کھائے کہ اس کی چھاتیاں آپس میں بھڑ بھڑ گئیں۔"گدھے۔۔۔تمہاری محبت ہی کہاں رہے گی۔جب تم نہ ہو گے۔۔۔تمہاری وہ۔۔۔ کیا نام ہے اس بھڑوی کا۔۔۔جب وہ بھی نہ رہے گی۔اس کا خاندان تک نہ رہے گا۔۔۔تم سکھ۔۔۔خدا کی قسم تم سکھ ہو اور بڑے ایڈیٹ سکھ ہو!"
ترلوچن بھنا گیا،"بکواس نہ کرو!"

موذیل زور سے ہنسی۔مہین مہین بالوں کے غبار سے اٹی ہوئی بانہیں اس نے ترلوچن کے گلے میں ڈال دیں اور تھوڑا سا جھول کر کہا،"ڈارلنگ چلو، جیسے تمہاری مرضی۔۔۔جاؤ پگڑی پہن آؤ۔میں نیچے بازار میں کھڑی ہوں۔"
یہ کہہ کر وہ نیچے جانے لگی۔ترلوچن نے اسے روکا،"تم کپڑے نہیں پہنو گی!"
موذیل نے اپنے سر کو جھٹکا دیا،"نہیں۔۔۔چلے گا اسی طرح۔"
یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتی نیچے اتر گئی۔ترلوچن نچلی منزل کی سیڑھیوں پر بھی اس کی کھڑاؤں کی

چوبی آواز سنتا رہا۔ پھر اس نے اپنے لمبے بال انگلیوں سے پیچھے کی طرف سمیٹے اور نیچے اتر کر اپنے فلیٹ میں چلا گیا۔ جلدی جلدی اس نے کپڑے تبدیل کیے۔ پگڑی بندھی بندھائی رکھی تھی۔ اسے اچھی طرح سر پر جمایا اور فلیٹ کا دروازہ مقفل کر کے نیچے اتر گیا۔

باہر فٹ پاتھ پر موذیل اپنی ننگی ٹانگیں چوڑی کیے سگرٹ پی رہی تھی۔ بالکل مردانہ انداز میں۔ جب ترلوچن اس کے نزدیک پہنچا تو اس نے شرارت کے طور پر منہ بھر کے دھواں اس کے چہرے پر دے مارا۔ ترلوچن نے غصے میں کہا،"تم بہت ذلیل ہو۔"
موذیل مسکرائی،"یہ تم نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔۔۔اس سے پہلے اور کئی مجھے ذلیل کہہ چکے ہیں۔" پھر اس نے ترلوچن کی پگڑی کی طرف دیکھا،"یہ پگڑی تم نے واقعی بہت اچھی طرح باندھی ہے۔۔۔ایسا معلوم ہوتا ہے تمہارے کیس ہیں۔"

بازار بالکل سنسان تھا۔ ایک صرف ہوا چل رہی تھی اور وہ بھی بہت دھیرے دھیرے۔ جیسے کرفیو سے خوف زدہ ہے۔ بتیاں روشن تھیں مگر ان کی روشنی بیمار سی معلوم ہوتی تھی۔ عام طور پر اس وقت ٹریمیں چلنی شروع ہو جاتی تھیں اور لوگوں کی آمدورفت بھی جاری ہو جاتی تھی۔ اچھی خاصی گہما گہمی ہوتی تھی۔ پر اب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سڑک پر کوئی انسان گزرا ہے نہ گزرے گا۔
موذیل آگے آگے تھی۔ فٹ پاتھ کے پتھروں پر اس کی کھڑاؤں کھٹ کھٹ کر رہی تھی۔ یہ آواز، اس خاموش فضا میں ایک بہت بڑا شور تھی۔ ترلوچن دل ہی دل میں موذیل کو برا بھلا کہہ رہا تھا کہ دو منٹ میں اور کچھ نہیں تو اپنی واہیات کھڑاؤں ہی اتار کر کوئی دوسری چیز پہن سکتی تھی۔ اس نے چاہا کہ موذیل سے کہے کھڑاؤں اتار دو اور ننگے پاؤں چلو۔ مگر اس کو یقین

تھا کہ وہ کبھی نہیں مانے گی۔اس لیے خاموش رہا۔

ترلوچن سخت خوف زدہ تھا۔کوئی پتا کھڑکتا تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا تھا۔مگر موذیل بالکل بے خوف چلی جارہی تھی۔سگرٹ کا دھواں اڑاتی جیسے وہ بڑی بے فکری سے چہل قدمی کررہا ہے۔
چوک میں پہنچے تو پولیس مین کی آواز گرجی،''اے۔۔۔کدھر جارہا ہے۔''

ترلوچن سہم گیا۔موذیل آگے بڑھی اور پولیس مین کے پاس پہنچ گئی اور بالوں کو ایک خفیف سا جھٹکا دے کر کہا،''اوہ،تم۔۔۔ہم کو پہچانا نہیں تم نے۔۔۔موذیل۔۔۔''پھر اس نے ایک گلی کی طرف اشارہ کیا،''ادھر اس باجو۔۔۔ہمارا بہن رہتا ہے۔اس کی طبیعت خراب ہے۔۔۔ڈاکٹر لے کر جارہا ہے۔۔۔''
سپاہی اسے پہچاننے کی کوشش کررہا تھا کہ اس نے خدا معلوم کہاں سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور ایک سگرٹ نکال کر اس کو دیا،''لو پیو۔''

سپاہی نے سگرٹ لے لیا۔موذیل نے اپنے منہ سے سلگا ہوا سگرٹ نکالا اور اس سے کہا،''ہیر از لائٹ!''
سپاہی نے سگرٹ کا کش لیا۔موذیل نے داہنی آنکھ اس کو اور بائیں آنکھ ترلوچن کو ماری اور کھٹ کھٹ کرتی اس گلی کی طرف چل دی۔۔۔جس میں سے گزر کر انھیں۔۔۔محلے جانا تھا۔
ترلوچن خاموش تھا،مگر وہ محسوس کررہا تھا کہ موذیل کرفیو کی خلاف ورزی کرکے ایک عجیب وغریب قسم کی مسرت محسوس کررہی ہے۔۔۔خطروں سے کھیلنا اسے پسند تھا۔جب جوہو پر اس

کے ساتھ جاتی تھی تو اس کے لیے ایک مصیبت بن جاتی تھی۔سمندر کی پیل تن لہروں سے ٹکراتی، بھڑتی وہ دور تک نکل جاتی تھی اور اس کو ہمیشہ اس بات کا دھڑکا رہتا تھا کہ وہ کہیں ڈوب نہ جائے۔جب واپس آتی تو اس کا جسم سیپیوں اور زخموں سے بھرا ہوتا تھا مگر اسے ان کی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔

موذیل آگے آگے تھی۔ترلوچن اس کے پیچھے پیچھے۔ڈرڈر کے ادھر ادھر دیکھتا رہتا تھا کہ اس کی بغل سے کوئی چھری مار نمودار نہ ہو جائے۔موذیل رک گئی۔جب ترلوچن پاس آیا تو اس نے سمجھانے کے انداز میں اس سے کہا،"ترلوچن ڈیئر۔۔۔اس طرح ڈرنا اچھا نہیں۔۔۔تم ڈرو گے تو ضرور کچھ نہ کچھ ہو کے رہے گا۔۔۔سچ کہتی ہوں، یہ میری آزمائی ہوئی بات ہے۔"

ترلوچن خاموش رہا۔

جب وہ گلی طے کر کے دوسری گلی میں پہنچے جو اس محلے کی طرف نکلتی تھی، جس میں کرپال کور رہتی تھی تو موذیل چلتے چلتے ایک دم رک گئی۔۔۔کچھ فاصلے پر بڑے اطمینان سے ایک مار واڑی کی دکان لوٹی جارہی تھی۔ایک لحظے کے لیے اس نے معاملے کا جائزہ لیا اور ترلوچن سے کہا،"کوئی بات نہیں۔۔۔چلو آؤ۔"

دونوں چلنے لگے۔۔۔ایک آدمی جو سر پر بہت بڑی پرات اٹھائے چلا آرہا تھا، ترلوچن سے ٹکرا گیا۔پرات گر گئی۔اس آدمی نے غور سے ترلوچن کی طرف دیکھا۔صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ سکھ ہے۔اس آدمی نے جلدی سے اپنے نیفے میں ہاتھ ڈالا۔۔۔کہ موذیل آ گئی۔لڑکھڑاتی ہوئی جیسے نشے میں چور ہے اس نے زور سے اس کو آدمی کو دھکا دیا اور مخمور لہجے میں کہا،"اے کیا کرتا ہے۔۔۔اپنے بھائی کو مارتا ہے۔۔۔ہم اس سے شادی بنانے کو مانگتا ہے۔" پھر وہ

ترلوچن سے مخاطب ہوئی،" کریم۔۔۔اٹھاؤ، یہ پرات اور رکھ دو اس کے سر پر۔"
اس آدمی نے نیفے میں سے ہاتھ نکال لیا اور شہوانی آنکھوں سے موذیل کی طرف دیکھا، پھر آگے بڑھ کر اپنی کہنی سے اس کی چھاتیوں میں ایک ٹہوکا دیا،" عیش کر سالی۔۔۔عیش کر" پھر اس نے پرات اٹھائی اور یہ جا، وہ جا۔

ترلوچن بڑبڑایا،" کیسی ذلیل حرکت کی ہے حرام زادے نے!"
موذیل نے اپنی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرا،" کوئی ذلیل حرکت نہیں۔۔۔سب چلتا ہے۔۔۔آؤ۔"

اور وہ تیز تیز چلنے لگی۔۔۔ترلوچن نے بھی قدم تیز کر دیے۔ یہ گلی طے کر کے دونوں اس محلے میں پہنچ گیے جہاں کرپال کور رہتی تھی۔ موذیل نے پوچھا،" کس گلی میں جانا ہے؟"
ترلوچن نے آہستہ سے کہا،" تیسری گلی میں۔۔۔نکڑ والی بلڈنگ!"

موذیل نے اس طرف چلنا شروع کر دیا۔ یہ راستہ بالکل خاموش تھا۔ آس پاس اتنی گنجان آبادی تھی مگر کسی بچے تک کے رونے کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔
جب وہ اس گلی کے قریب پہنچے تو کچھ گڑ بڑ دکھائی دی۔۔۔ایک آدمی اس کنارے والی بلڈنگ سے نکلا اور دوسرے کنارے والی بلڈنگ میں گھس گیا۔ اس بلڈنگ سے تھوڑی دیر کے بعد تین آدمی نکلے۔ فٹ پاتھ پر انھوں نے ادھر ادھر دیکھا اور بڑی پھرتی سے دوسری بلڈنگ میں چلے گئے۔ موذیل ٹھٹک گئی تھی۔ اس نے ترلوچن کو اشارہ کیا کہ اندھیرے میں ہو جائے۔ پھر اس نے ہولے سے کہا،" ترلوچن ڈیئر۔۔۔یہ پگڑی اتار دو!"

ترلوچن نے جواب دیا،" میں یہ کسی صورت میں بھی نہیں اتار سکتا!"

موذیل جھنجھلا گئی، ''تمہاری مرضی۔۔۔لیکن تم دیکھتے نہیں، سامنے کیا ہو رہا ہے۔''

سامنے جو کچھ ہو رہا تھا دونوں کی آنکھوں کے سامنے تھا۔۔۔صاف گڑ بڑ ہو رہی تھی اور بڑی پراسرار قسم کی۔ دائیں ہاتھ کی بلڈنگ سے جب دو آدمی اپنی پیٹھ پر بوریاں اٹھائے نکلے تو موذیل ساری کی ساری کانپ گئی۔ ان میں سے کچھ گاڑھی گاڑھی سیال سی چیز ٹپک رہی تھی۔ موذیل اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ غالباً وہ سوچ رہی تھی۔ جب یہ دونوں آدمی گلی کے دوسرے سرے پر پہنچ کر غائب ہو گئے تو اس نے ترلوچن سے کہا، ''دیکھو، ایسا کرو۔۔۔میں بھاگ کر نکڑ والی بلڈنگ میں جاتی ہوں۔۔۔تم میرے پیچھے آنا۔۔۔بڑی تیزی سے، جیسے تم میرا پیچھا کر رہے ہو۔۔۔سمجھے۔۔۔مگر یہ سب ایک دم جلدی جلدی میں ہو۔''
موذیل نے ترلوچن کے جواب کا انتظار نہ کیا اور نکڑ والی بلڈنگ کی طرف کھڑاؤں کھٹکھٹاتی بڑی تیزی سے بھاگی۔ ترلوچن بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ چند لمحوں میں وہ بلڈنگ کے اندر تھے۔۔۔سیڑھیوں کے پاس۔ ترلوچن ہانپ رہا تھا۔ مگر موذیل بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ اس نے ترلوچن سے پوچھا، ''کون سا مالا؟''

ترلوچن نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری، ''دوسرا۔''
''چلو۔''

یہ کہہ کر وہ کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ ترلوچن اس کے پیچھے ہو لیا۔ زینوں پر خون کے بڑے بڑے دھبے پڑے تھے۔ ان کو دیکھ دیکھ کر اس کا خون خشک ہو رہا تھا۔ دوسرے مالے پر پہنچے تو کوری ڈور میں کچھ دور جا کر ترلوچن نے ہولے سے ایک دروازے پر

دستک دی۔ موذیل دور سیڑھیوں کے پاس کھڑی رہی۔ ترلوچن نے ایک بار پھر دستک دی اور دروازے کے ساتھ منہ لگا کر آواز دی۔

''مہنگا سنگھ جی۔۔۔ مہنگا سنگھ جی!''

اندر سے مہین آواز آئی ''کون؟''

''ترلوچن!''

دروازہ دھیرے سے کھلا۔۔۔ ترلوچن نے موذیل کو اشارہ کیا۔ وہ لپک کر آئی دونوں اندر داخل ہوئے۔۔۔ موذیل نے اپنی بغل میں ایک دبلی پتلی لڑکی کو دیکھا۔۔۔ جو بے حد سہمی ہوئی تھی۔ موذیل نے اس کو ایک لحظے کے لیے غور سے دیکھا۔ پتلے پتلے نقش تھے۔ ناک بہت ہی پیاری تھی مگر زکام میں مبتلا۔ موذیل نے اس کو اپنے چوڑے چکلے سینے کے ساتھ لگا لیا اور اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے کا دامن اٹھا کر اس کی ناک پونچھی۔ ترلوچن سرخ ہو گیا۔

موذیل نے کرپال کور سے بڑے پیار کے ساتھ کہا ''ڈرو نہیں، ترلوچن تمہیں لینے آیا ہے۔''

کرپال کور نے ترلوچن کی طرف اپنی سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور موذیل سے الگ ہو گئی۔ ترلوچن نے اس سے کہا ''سردار صاحب سے کہو کہ جلدی تیار ہو جائیں۔۔۔ اور اپنی ماتا جی سے بھی۔۔۔ لیکن جلدی کرو۔'' اتنے میں اوپر کی منزل پر بلند آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی چیخ چلا رہا ہے اور دھینگا مشتی ہو رہی ہے۔ کرپال کور کے حلق سے دبی دبی چیخ بلند ہوئی ''اسے پکڑ لیا انھوں نے!''

ترلوچن نے پوچھا ''کسے؟''

کرپال کور جواب دینے ہی والی تھی کہ موذیل نے اس کو بازو سے پکڑ اور گھسیٹ کر ایک

کونے میں لے گئی۔" پکڑ لیا تو اچھا ہوا۔۔۔ تم یہ کپڑے اتارو۔"

کرپال کور ابھی کچھ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ موذیل نے آنا فانا اس کی قمیص اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ کرپال کور نے اپنی بانھوں میں اپنے ننگے جسم کو چھپا لیا اور سخت وحشت زدہ ہو گئی۔ ترلوچن نے منہ دوسری طرف منہ موڑ لیا۔ موذیل نے اپنا ڈھیلا ڈھالا کرتا اتارا اور اس کو پہنا دیا۔ خود وہ ننگ دھڑنگ تھی۔ جلدی جلدی اس نے کرپال کور کا ازار بند ڈھیلا کیا اور اس کی شلوار اتار کر، ترلوچن سے کہنے لگی، "جاؤ، اسے لے جاؤ۔۔۔ لیکن ٹھہرو۔" یہ کہہ کر اس نے کرپال کور کے بال کھول دیے اور اس سے کہا، "جاؤ۔۔۔ جلدی نکل جاؤ۔"

ترلوچن نے اس سے کہا، "آؤ۔" مگر فوراً ہی رک گیا۔ پلٹ کر اس نے موذیل کی طرف دیکھا جو دھوئے دیدے کی طرح ننگی کھڑی تھی۔ اس کی بانھوں پر مہین مہین بال سردی کے باعث جاگے ہوئے تھے۔

"تم جاتے کیوں نہیں ہو؟" موذیل کے لہجے میں چڑچڑا پن تھا۔

ترلوچن نے آہستہ سے کہا، "اس کے ماں باپ بھی تو ہیں۔"

"جہنم میں جائیں وہ۔۔۔ تم اسے لے جاؤ۔"

"اور تم؟"

"میں آجاؤں گی۔"

ایک دم اوپر کی منزل سے کئی آدمی دھڑا دھڑ نیچے اترنے لگے۔ دروازے کے پاس آ کر انھوں نے اسے کوٹنا شروع کر دیا جیسے وہ اسے توڑ ہی ڈالیں گے۔ کرپال کور کی اندھی ماں

اوراس کا مفلوج باپ دوسرے کمرے میں پڑے کراہ رہے تھے۔موذیل نے کچھ سوچا اور بالوں کوخفیف سا جھٹکا دے کراس نے ترلوچن سے کہا،’’سنو۔اب صرف ایک ہی ترکیب سمجھ میں آتی ہے۔۔۔میں دروازہ کھولتی ہوں۔۔۔‘‘

کرپال کور کے خشک حلق سے چیخ نکلتی نکلتی دب گئی،’’دروازہ۔‘‘
موذیل،ترلوچن سے مخاطب رہی،’’میں دروازہ کھول کر باہر نکلتی ہوں،تم میرے پیچھے بھاگنا۔ میں اوپر چڑھ جاؤں گی۔تم بھی اوپر چلے آنا۔ یہ جولوگ جو دروازہ توڑ رہے ہیں،سب کچھ بھول جائیں گے اور ہمارے پیچھے چلے آئیں گے۔۔۔‘‘

ترلوچن نے پھر پوچھا،’’پھر؟‘‘
موذیل نے کہا،’’یہ تمہاری۔۔۔کیا نام ہے اس کا۔۔۔موقعہ پا کر نکل جائے۔۔۔اس لباس میں اسے کوئی کچھ نہ کہے گا۔‘‘

ترلوچن نے جلدی جلدی کرپال کور کو ساری بات سمجھا دی۔موذیل زور سے چلائی۔دروازہ کھولا اور دھڑام سے باہر کے لوگوں پر گری۔۔۔سب بوکھلا گیے۔اٹھ کر اس نے اوپر کی سیڑھیوں کا رخ کیا۔ترلوچن اس کے پیچھے بھاگا۔سب ایک طرف ہٹ گیے۔
موذیل اندھا دھند سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں۔۔۔کھڑاؤں اس کے پیروں میں تھی۔۔۔وہ جو لوگ جو دروازہ توڑنے کی کوشش کررہے تھے سنبھل کر ان کے تعاقب میں دوڑے۔ موذیل کا پاؤں پھسلا۔۔۔اوپر کے زینے سے وہ کچھ اس طرح لڑھکی کہ ہر پتھریلے زینے کے ساتھ ٹکراتی،لوہے کے جنگلے کے ساتھ الجھتی وہ نیچے آرہی۔۔۔پتھریلے فرش پر۔

ترلوچن ایک دم نیچے اترا۔ جھک کر اس نے دیکھا تو اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ کانوں کے رستہ بھی خون نکل رہا تھا۔ وہ جو دروازہ توڑنے آئے تھے ارد گرد جمع ہو گیے۔۔۔کسی نے بھی نہ پوچھا کیا ہوا ہے۔ سب خاموش تھے اور موذیل کے ننگے اور گورے جسم کو دیکھ رہے تھے۔ جس پر جا بجا خراشیں پڑی تھیں۔

ترلوحن نے اس کا بازو ہلایا اور آواز دی ”موذیل۔۔۔موذیل۔“

موذیل نے اپنی بڑی بڑی یہودی آنکھیں کھولیں جو لال بوٹی ہو رہی تھیں اور مسکرائی۔ ترلوچن نے اپنی پگڑی اتاری اور کھول کر اس کا ننگا جسم ڈھک دیا۔ موذیل پھر مسکرائی اور آنکھ مار کر اس نے ترلوچن سے منہ میں خون کے بلبلے اڑاتے ہوئے کہا ”جاؤ، دیکھو۔۔۔ میرا انڈر رویئر وہاں ہے کہ نہیں۔۔۔میرا مطلب ہے وہ۔۔۔“

ترلوچن اس کا مطلب سمجھ گیا مگر اس نے اٹھنا نہ چاہا۔ اس پر موذیل نے غصے میں کہا ”تم سچ مچ سکھ ہو۔۔۔جاؤ دیکھ کر آؤ۔“

ترلوچن اٹھ کر کرپال کور کے فلیٹ کی طرف چلا گیا۔ موذیل نے اپنی دھندلی آنکھوں سے آس پاس کھڑے مردوں کی طرف دیکھا اور کہا ”یہ میاں بھائی ہے۔۔۔لیکن بہت دادا قسم کا۔۔۔میں اسے سکھ کہا کرتی ہوں۔“

ترلوچن واپس آ گیا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں موذیل کو بتا دیا کہ کرپال کور جا چکی ہے۔۔۔موذیل نے اطمینان کا سانس لیا۔۔۔لیکن ایسا کرنے سے بہت سا خون اس کے منہ سے بہہ نکلا ”اوہ ڈیم اٹ۔۔۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی مہین مہین بالوں سے اٹی ہوئی کلائی سے اپنا منہ پونچھا اور ترلوچن سے مخاطب ہوئی ”آل رائٹ ڈارلنگ۔۔۔بائی بائی۔“

ترلوچن نے کچھ کہنا چاہا، مگر لفظ اس کے حلق میں اٹک گیے ۔موذیل نے اپنے بدن پر سے ترلوچن کی پگڑی ہٹائی ۔

''لے جاؤ اس کو۔۔۔اپنے اس مذہب کو۔''اور اس کا بازو اس کی مضبوط چھاتیوں پر بے حس ہو کر گر پڑا۔

❁❁❁

کھول دو

امرتسر سے اسپیشل ٹرین دو پہر دو بجے کو چلی اور آٹھ گھنٹوں کے بعد مغل پورہ پہنچی۔ راستے میں کئی آدمی مارے گئے۔ متعدد زخمی ہوئے اور کچھ ادھر ادھر بھٹک گئے۔
صبح دس بجے۔۔۔ کیمپ کی ٹھنڈی زمین پر جب سراج الدین نے آنکھیں کھولیں اور اپنے چاروں طرف مردوں، عورتوں اور بچوں کا ایک متلاطم سمندر دیکھا تو اس کی سوچنے سمجھنے کی قوتیں اور بھی ضعیف ہوگئیں۔ وہ دیر تک گدلے آسمان کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ یوں تو کیمپ میں ہر طرف شور برپا تھا۔ لیکن بوڑھے سراج الدین کے کان جیسے بند تھے۔ اسے کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ کوئی اسے دیکھتا تو یہ خیال کرتا کہ وہ کسی گہری فکر میں غرق ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ اس کے ہوش وحواس شل تھے۔ اس کا سارا وجود خلا میں معلق تھا۔

گدلے آسمان کی طرف بغیر کسی ارادے کے دیکھتے دیکھتے سراج الدین کی نگاہیں سورج سے ٹکرائیں۔ تیز روشنی اس کے وجود کے رگ و ریشے میں اتر گئی اور وہ جاگ اٹھا۔ اوپر تلے اس کے دماغ پر کئی تصویریں دوڑ گئیں۔ لوٹ۔۔۔ آگ۔۔۔ بھاگم بھاگ۔۔۔ اسٹیشن۔۔۔ گولیاں۔۔۔ رات اور سکینہ۔۔۔ سراج الدین ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور پاگلوں کی طرح اس نے اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے انسانوں کے سمندر کو کھنگالنا شروع کیا۔
پورے تین گھنٹے وہ ”سکینہ، سکینہ“ پکارتا کیمپ میں خاک چھانتا رہا۔ مگر اسے اپنی جوان اکلوتی

بیٹی کا کوئی پتا نہ ملا۔ چاروں طرف ایک دھاندلی سی مچی تھی۔کوئی اپنا بچہ ڈھونڈ رہا تھا،کوئی ماں،کوئی بیوی اور کوئی بیٹی۔سراج الدین تھک ہار کر ایک طرف بیٹھ گیا اور حافظے پر زور دے کر سوچنے لگا کہ سکینہ اس سے کب اور کہاں جدا ہوئی۔لیکن سوچتے سوچتے اس کا دماغ سکینہ کی ماں کی لاش پر جم جاتا۔جس کی ساری انتڑیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔اس سے آگے وہ اور کچھ نہ سوچ سکتا۔

سکینہ کی ماں مر چکی تھی۔اس نے سراج الدین کی آنکھوں کے سامنے دم توڑا تھا۔لیکن سکینہ کہاں تھی جس کے متعلق اس کی ماں نے مرتے ہوئے کہا تھا''مجھے چھوڑ و اور سکینہ کو لے کر جلدی یہاں سے بھاگ جاؤ۔''

سکینہ اس کے ساتھ ہی تھی۔دونوں ننگے پاؤں بھاگ رہے تھے۔سکینہ کا دوپٹہ گر پڑا تھا۔اسے اٹھانے کے لیے اس نے رکنا چاہا تھا مگر سکینہ نے چلا کر کہا تھا''ابا جی۔۔۔چھوڑیے۔''لیکن اس نے دوپٹہ اٹھا لیا تھا۔۔۔یہ سوچتے سوچتے اس نے اپنے کوٹ کی ابھری ہوئی جیب کی طرف دیکھا اور اس میں ہاتھ ڈال کر ایک کپڑا نکالا۔۔سکینہ کا وہی دوپٹہ تھا۔۔لیکن سکینہ کہاں تھی؟

سراج الدین نے اپنے تھکے ہوئے دماغ پر بہت زور دیا مگر وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔کیا وہ سکینہ کو اپنے ساتھ اسٹیشن تک لے آیا تھا۔۔؟ کیا وہ اس کے ساتھ ہی گاڑی میں سوار تھی۔۔؟ راستہ میں جب گاڑی روکی گئی تھی اور بلوائی اندر گھس آئے تھے تو کیا وہ بے ہوش ہو گیا تھا جو وہ سکینہ کو اٹھا کر لے گیے؟

سراج الدین کے دماغ میں سوال ہی سوال تھے، جواب کوئی بھی نہیں تھا۔اس کو ہمدردی

کی ضرورت تھی لیکن چاروں طرف جتنے بھی انسان پھیلے ہوئے تھے سب کو ہمدردی کی ضرورت تھی۔ سراج الدین نے رونا چاہا مگر آنکھوں نے اس کی مدد نہ کی۔ آنسو جانے کہاں غائب ہو گیے تھے۔ چھ روز کے بعد جب ہوش و حواس کسی قدر درست ہوئے تو سراج الدین ان لوگوں سے ملا جو اس کی مدد کرنے کے لیے تیار تھے۔ آٹھ نوجوان تھے۔ جن کے پاس لاری تھی، بندوقیں تھیں۔ سراج الدین نے ان کو لاکھ لاکھ دعائیں دیں اور سکینہ کا حلیہ بتایا، ''گورا رنگ ہے اور بہت ہی خوبصورت ہے۔۔۔ مجھ پر نہیں اپنی ماں پر تھی۔۔۔ عمر سترہ برس کے قریب ہے۔۔۔ آنکھیں بڑی بڑی۔۔۔ بال سیاہ، داہنے گال پر موٹا سا تل۔۔۔ میری اکلوتی لڑکی ہے۔ ڈھونڈ لاؤ۔ تمہارا خدا بھلا کرے گا۔''

رضا کار نوجوانوں نے بڑے جذبے کے ساتھ بوڑھے سراج الدین کو یقین دلایا کہ اگر اس کی بیٹی زندہ ہوئی تو چند ہی دنوں میں اس کے پاس ہو گی۔
آٹھوں نوجوانوں نے کوشش کی۔ جان ہتھیلیوں پر رکھ کر وہ امرتسر گیے۔ کئی عورتوں، کئی مردوں اور کئی بچوں کو نکال نکال کر انھوں نے محفوظ مقاموں پر پہنچایا۔ دس روز گزر گیے مگر انھیں سکینہ کہیں نہ ملی۔

ایک روز وہ اسی خدمت کے لیے لاری پر امرتسر جا رہے تھے کہ چھ ہرٹہ کے پاس سڑک پر انھیں ایک لڑکی دکھائی دی۔ لاری کی آواز سن کر وہ بدکی اور بھاگنا شروع کر دیا۔ رضا کاروں نے موٹر روکی اور سب کے سب اس کے پیچھے بھاگے۔ ایک کھیت میں انھوں نے لڑکی کو پکڑ لیا۔ دیکھا تو بہت خوبصورت تھی۔ داہنے گال پر موٹا تل تھا۔ ایک لڑکے نے اس سے کہا، ''گھبراؤ نہیں۔۔۔ کیا تمہارا نام سکینہ ہے؟''

لڑکی کا رنگ اور بھی زرد ہو گیا۔اس نے کوئی جواب نہ دیا۔لیکن جب تمام لڑکوں نے اسے دم دلاسا دیا تو اس کی وحشت دور ہوئی اور اس نے مان لیا کہ وہ سراج الدین کی بیٹی سکینہ ہے۔

آٹھ رضا کار نوجوانوں نے ہر طرح سکینہ کی دلجوئی کی۔اسے کھانا کھلایا۔دودھ پلایا اور لاری میں بٹھا دیا۔ایک نے اپنا کوٹ اتار کر اسے دے دیا۔کیونکہ دوپٹہ نہ ہونے کے باعث وہ بہت الجھن محسوس کر رہی تھی۔اور بار بار باھنوں سے اپنے سینے کو ڈھانکنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھی۔

کئی دن گزر گیے۔۔۔سراج الدین کو سکینہ کی کوئی خبر نہ ملی۔وہ دن بھر مختلف کیمپوں اور دفتروں کے چکر کاٹتا رہتا۔لیکن کہیں سے بھی اس کی بیٹی کا پتہ نہ چلا۔رات کو وہ بہت دیر تک ان رضا کار نوجوانوں کی کامیابی کے لیے دعائیں مانگتا رہتا۔جنہوں نے اس کو یقین دلایا تھا کہ اگر سکینہ زندہ ہوئی تو چند دنوں ہی میں وہ اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔

ایک روز سراج الدین نے کیمپ میں ان نوجوان رضا کاروں کو دیکھا۔لاری میں بیٹھے تھے۔سراج الدین بھاگا بھاگا ان کے پاس گیا۔لاری چلنے ہی والی تھی کہ اس نے پوچھا،"بیٹا، میری سکینہ کا پتہ چلا؟"

سب نے یک زبان ہو کر کہا،"چل جائے گا، چل جائے گا۔"اور لاری چلا دی۔سراج الدین نے ایک بار پھر ان نوجوانوں کی کامیابی کے لیے دعا مانگی اور اس کا جی کسی قدر ہلکا ہو گیا۔

شام کے قریب کیمپ میں جہاں سراج الدین بیٹھا تھا، اس کے پاس ہی کچھ گڑبڑ سی ہوئی۔

چار آدمی کچھ اٹھا کر لا رہے تھے۔ اس نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک لڑکی ریلوے لائن کے پاس بے ہوش پڑی تھی۔ لوگ اسے اٹھا کر لائے ہیں۔ سراج الدین ان کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ لوگوں نے لڑکی کو ہسپتال والوں کے سپرد کیا اور چلے گیے۔ کچھ دیر وہ ایسے ہی ہسپتال کے باہر گڑے ہوئے لکڑی کے کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اندر چلا گیا۔ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک اسٹریچر تھا جس پر ایک لاش پڑی تھی۔ سراج الدین چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کی طرف بڑھا۔ کمرے میں دفعتاً روشنی ہوئی۔ سراج الدین نے لاش کے زرد چہرے پر چمکتا ہوا تل دیکھا اور چلایا۔

"سکینہ!"

ڈاکٹر نے جس نے کمرے میں روشنی کی تھی سراج الدین سے پوچھا "کیا ہے؟"

سراج الدین کے حلق سے صرف اس قدر نکل سکا، "جی میں۔۔۔ جی میں۔۔۔ اس کا باپ ہوں!"

ڈاکٹر نے اسٹریچر پر پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھا۔ اس کی نبض ٹٹولی اور سراج الدین سے کہا، "کھڑکی کھول دو۔"

سکینہ کے مردہ جسم میں جنبش پیدا ہوئی۔ بے جان ہاتھوں سے اس نے ازار بند کھولا اور شلوار نیچے سرکا دی۔

بوڑھا سراج الدین خوشی سے چلایا، "زندہ ہے۔۔۔ میری بیٹی زندہ ہے۔۔۔"

ڈاکٹر سر سے پیر تک پسینے میں غرق ہو گیا۔۔۔

کالی شلوار

دہلی آنے سے پہلے وہ انبالہ چھاؤنی میں تھی جہاں کئی گورے اس کے گاہک تھے۔ ان گوروں سے ملنے جلنے کے باعث وہ انگریزی کے دس پندرہ جملے سیکھ گئی تھی، ان کو وہ عام گفتگو میں استعمال نہیں کرتی تھی لیکن جب وہ دہلی میں آئی اور اس کا کاروبار نہ چلا تو ایک روز اس نے اپنی پڑوسن طمنچہ جان سے کہا،''دِس لیف۔۔۔ویری بیڈ۔'' یعنی یہ زندگی بہت بری ہے جبکہ کھانے ہی کو نہیں ملتا۔

انبالہ چھاؤنی میں اس کا دھندا بہت اچھی طرح چلتا تھا۔ چھاؤنی کے گورے شراب پی کر اس کے پاس آجاتے تھے اور وہ تین چار گھنٹوں ہی میں آٹھ دس گوروں کو نمٹا کر بیس تیس روپے پیدا کرلیا کرتی تھی۔ یہ گورے، اس کے ہم وطنوں کے مقابلے میں بہت اچھے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایسی زبان بولتے تھے جس کا مطلب سلطانہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر ان کی زبان سے یہ لاعلمی اس کے حق میں بہت اچھی ثابت ہوتی تھی۔ اگر وہ اس سے کچھ رعایت چاہتے تو وہ سر ہلا کر کہہ دیا کرتی تھی،''صاحب، ہماری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آتا۔'' اور اگر وہ اس سے ضرورت سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کرتے تو وہ ان کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیتی تھی۔ وہ حیرت میں اس کے منہ کی طرف دیکھتے تو وہ ان سے کہتی،''صاحب، تم ایک دم الو کا پٹھا ہے۔ حرامزادہ ہے۔۔۔سمجھا۔'' یہ کہتے وقت وہ اپنے لہجہ میں سختی پیدا نہ کرتی بلکہ بڑے پیار کے ساتھ ان سے باتیں کرتی۔ یہ گورے ہنس دیتے اور ہنستے وقت وہ سلطانہ کو

بالکل الو کے پٹھے دکھائی دیتے۔

مگر یہاں دہلی میں وہ جب سے آئی تھی ایک گورا بھی اس کے یہاں نہیں آیا تھا۔تین مہینے اس کو ہندوستان کے اس شہر میں رہتے ہوگیے تھے جہاں اس نے سنا تھا کہ بڑے لاٹ صاحب رہتے ہیں، جو گرمیوں میں شملے چلے جاتے ہیں،مگر صرف چھ آدمی اس کے پاس آئے تھے۔صرف چھ،یعنی مہینے میں دو اوران چھ گاہکوں سے اس نے خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کیے تھے۔تین روپے سے زیادہ پرکوئی مانتاہی نہیں تھا۔سلطانہ نے ان میں سے پانچ آدمیوں کو اپنا ریٹ دس روپے بتایا تھا مگر تعجب کی بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے یہی کہا،''بھئی ہم تین روپے سے ایک کوڑی زیادہ نہ دیں گے۔''نہ جانے کیابات تھی کہ ان میں سے ہر ایک نے اسے صرف تین روپے کے قابل سمجھا۔

چنانچہ جب چھٹا آیا تو اس نے خود اس سے کہا،''دیکھو،میں تین روپے ایک ٹیم کے لوں گی۔ اس سے ایک دھیلا تم کم کہو تو میں نہ لوں گی۔اب تمہاری مرضی ہو تو رہو ورنہ جاؤ۔''چھٹے آدمی نے یہ بات سن کر تکرار نہ کی اور اس کے ہاں ٹھہر گیا۔جب دوسرے کمرے میں دروازے وروازے بند کرکے وہ اپنا کوٹ اتارنے لگا تو سلطانہ نے کہا،''لائیے ایک روپیہ دودھ کا۔'' اس نے ایک روپیہ تو نہ دیا لیکن نئے بادشاہ کی چمکتی ہوئی اٹھنی جیب میں سے نکال کر اس کو دے دی اور سلطانہ نے بھی چپکے سے لے لی کہ چلو جو آیا ہے غنیمت ہے۔

ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینوں میں۔۔۔بیس روپے ماہوار تو اس کوٹھے کا کرایہ تھا جس کو مالک مکان انگریزی زبان میں فلیٹ کہتا تھا۔اس فلیٹ میں ایسا پاخانہ تھا جس میں زنجیر کھینچنے سے ساری گندگی پانی کے زور سے ایک دم نیچے نل میں غائب ہو جاتی تھی اور بڑا شور

ہوتا تھا۔شروع شروع میں تو اس شور نے اسے بہت ڈرایا تھا۔ پہلے دن جب وہ رفع حاجت کے لیے اس پاخانہ میں گئی تو اس کے کمر میں شدت کا درد ہو رہا تھا۔فارغ ہو کر جب اٹھنے لگی تو اس نے لٹکی ہوئی زنجیر کا سہارا لے لیا۔اس زنجیر کو دیکھ کر اس نے خیال کیا چونکہ یہ مکان خاص ہم لوگوں کی رہائش کے لیے تیار کیے گیے ہیں، یہ زنجیر اس لیے لگائی گئی ہے کہ اٹھتے وقت تکلیف نہ ہو اور سہارا مل جایا کرے مگر جونہی اس نے زنجیر پکڑ کر اٹھنا چاہا، اوپر کھٹ کھٹ سی ہوئی اور پھر ایک دم پانی اس شور کے ساتھ باہر نکلا کہ ڈر کے مارے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

خدا بخش دوسرے کمرے میں اپنا فوٹوگرافی کا سامان درست کر رہا تھا اور ایک صاف بوتل میں ہائی ڈروکونین ڈال رہا تھا کہ اس نے سلطانہ کی چیخ سنی۔دوڑ کر وہ باہر نکلا اور سلطانہ سے پوچھا ’’کیا ہوا؟۔۔۔یہ چیخ تمہاری تھی؟‘‘

سلطانہ کا دل دھڑک رہا تھا۔اس نے کہا ’’یہ موا پاخانہ ہے یا کیا ہے۔بیچ میں یہ ریل گاڑیوں کی طرح زنجیر کیا لٹکا رکھی ہے۔میری کمر میں درد تھا۔میں نے کہا چلو اس کا سہارا لے لوں گی، پر اس موئی زنجیر کو چھیڑنا تھا کہ وہ دھماکہ ہوا کہ میں تم سے کیا کہوں۔‘‘

اس پر خدا بخش بہت ہنسا تھا اور اس نے سلطانہ کو اس پیخانے کی بابت سب کچھ بتا دیا تھا کہ یہ نئے فیشن کا ہے جس میں زنجیر ہلانے سے سب گندگی نیچے زمین میں دھنس جاتی ہے۔

خدا بخش اور سلطانہ کا آپس میں کیسے سمبندھ ہوا یہ ایک لمبی کہانی ہے۔خدا بخش راولپنڈی کا تھا۔انٹرنس پاس کرنے کے بعد اس نے لاری چلانا سیکھا، چنانچہ چار برس تک وہ راولپنڈی اور کشمیر کے درمیان لاری چلانے کا کام کرتا رہا۔اس کے بعد کشمیر میں اس کی دوستی ایک

عورت سے ہوگئی۔ اس کو بھگا کر وہ لاہور لے آیا۔ لاہور میں چونکہ اس کو کوئی کام نہ ملا۔ اس لیے اس نے عورت کو پیشے بٹھا دیا۔ دو تین برس تک یہ سلسلہ جاری رہا اور وہ عورت کسی اور کے ساتھ بھاگ گئی۔ خدا بخش کو معلوم ہوا کہ وہ انبالہ میں ہے۔ وہ اس کی تلاش میں انبالہ آیا جہاں اس کو سلطانہ مل گئی۔ سلطانہ نے اس کو پسند کیا، چنانچہ دونوں کا سمبندھ ہو گیا۔
خدا بخش کے آنے سے ایک دم سلطانہ کا کاروبار چمک اٹھا۔ عورت چوں کہ ضعیف الاعتقاد تھی اس لیے اس نے سمجھا کہ خدا بخش بڑا بھاگوان ہے جس کے آنے سے اتنی ترقی ہوگئی، چنانچہ اس خوش اعتقادی نے خدا بخش کی وقعت اس کی نظروں میں اور بھی بڑھا دی۔

خدا بخش آدمی محنتی تھا۔ سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک فوٹو گرافر سے دوستی پیدا کی جو ریلوے اسٹیشن کے باہر منٹ کیمرے سے فوٹو کھینچا کرتا تھا۔ اس لیے اس نے فوٹو کھینچنا سیکھ لیا۔ پھر سلطانہ سے ساٹھ روپے لے کر کیمرہ بھی خرید لیا۔ آہستہ آہستہ ایک پردہ بنوایا، دو کرسیاں خریدیں اور فوٹو دھونے کا سب سامان لے کر اس نے علیحدہ اپنا کام شروع کر دیا۔
کام چل نکلا، چنانچہ اس نے تھوڑی ہی دیر کے بعد اپنا اڈا انبالے چھاؤنی میں قائم کر دیا۔ یہاں وہ گوروں کے فوٹو کھینچتا رہتا۔ ایک مہینے کے اندر اندر اس کی چھاؤنی کے متعدد گوروں سے واقفیت ہوگئی، چنانچہ وہ سلطانہ کو وہیں لے گیا۔ یہاں چھاؤنی میں خدا بخش کے ذریعہ سے کئی گورے سلطانہ کے مستقل گاہک بن گیے اور اس کی آمدنی پہلے سے دوگنی ہوگئی۔

سلطانہ نے کانوں کے لیے بُندے خریدے۔ ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں بھی بنوا لیں۔ دس پندرہ اچھی اچھی ساڑیاں بھی جمع کر لیں، گھر میں فرنیچر وغیرہ بھی آ گیا۔ قصہ مختصر یہ کہ انبالہ

چھاؤنی میں وہ بڑی خوش حال تھی مگر ایکا ایکی نہ جانے خدا بخش کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے دہلی جانے کی ٹھان لی۔ سطانہ انکار کیسے کرتی جبکہ خدا بخش کو اپنے لیے بہت مبارک خیال کرتی تھی۔ اس نے خوشی خوشی دہلی جانا قبول کرلیا۔ بلکہ اس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے بڑے شہر میں جہاں لاٹ صاحب رہتے ہیں اس کا دھندا اور بھی اچھا چلے گا۔ اپنی سہیلیوں سے وہ دہلی کی تعریف سن چکی تھی۔ پھر وہاں حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ تھی جس سے اسے بے حد عقیدت تھی، چنانچہ جلدی جلدی گھر کا بھاری سامان بیچ باچ کر وہ خدا بخش کے ساتھ دہلی آ گئی۔ یہاں پہنچ کر خدا بخش نے بیس روپے ماہوار پر ایک چھوٹا سا فلیٹ لے لیا جس میں وہ دونوں رہنے لگے۔

ایک ہی قسم کے نئے مکانوں کی لمبی سی قطار سڑک کے ساتھ ساتھ چلی گئی تھی۔ میونسپل کمیٹی نے شہر کا یہ حصہ خاص کسبیوں کے لیے مقرر کر دیا تھا تاکہ وہ شہر میں جگہ جگہ اپنے اڈے نہ بنائیں۔ نیچے دکانیں تھیں اور اوپر دو منزلہ رہائشی فلیٹ۔ چونکہ سب عمارتیں ایک ہی ڈیزائن کی تھیں اس لیے شروع شروع میں سلطانہ کو اپنا فلیٹ تلاش کرنے میں بہت دقت محسوس ہوئی تھی، پر جب نیچے لانڈری والے نے اپنا بورڈ گھر کی پیشانی پر لگا دیا تو اس کو ایک پکی نشانی مل گئی۔ ”یہاں میلے کپڑوں کی دھلائی کی جاتی ہے“ یہ بورڈ پڑھتے ہی وہ اپنا فلیٹ تلاش کرلیا کرتی تھی۔

اسی طرح اس نے اور بہت سی نشانیاں قائم کرلی تھیں، مثلاً بڑے بڑے حروف میں جہاں ’کوئلوں کی دوکان‘ لکھا تھا وہاں اس کی سہیلی ہیرا بائی رہتی تھی جو کبھی کبھی ریڈیو گھر میں گانے جایا کرتی تھی۔ جہاں ’شرفا کے کھانے کا اعلیٰ انتظام ہے‘ لکھا تھا وہاں اس کی دوسری

سہیلی مختار رہتی تھی۔نواڑ کے کارخانہ کے اوپر انوری رہتی تھی جو اسی کارخانہ کے سیٹھ کے پاس ملازم تھی۔ چونکہ سیٹھ صاحب کو رات کے وقت اپنے کارخانہ کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی اس لیے وہ انوری کے پاس ہی رہتے تھے۔

دوکان کھولتے ہی گاہک تھوڑے ہی آتے ہیں۔ چنانچہ جب ایک مہینے تک سلطانہ بیکار رہی تو اس نے یہی سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی، پر جب دو مہینے گزر گیے اور کوئی آدمی اس کے کوٹھے پر نہ آیا تو اسے بہت تشویش ہوئی۔اس نے خدا بخش سے کہا،"کیا بات ہے خدا بخش، دو مہینے آج پورے ہو گیے ہیں ہمیں یہاں آئے ہوئے،کسی نے ادھر کا رخ بھی نہیں کیا۔۔۔ مانتی ہوں آج کل بازار بہت مندا ہے، پر اتنا مندا بھی تو نہیں کہ مہینے بھر میں کوئی شکل دیکھنے ہی میں نہ آئے۔"

خدا بخش کو بھی یہ بات بہت عرصہ سے کھٹک رہی تھی مگر وہ خاموش تھا، پر جب سلطانہ نے خود بات چھیڑی تو اس نے کہا،"میں کئی دنوں سے اس کی بابت سوچ رہا ہوں۔ایک بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ کہ جنگ کی وجہ سے لوگ باگ دوسرے دھندوں میں پڑ کر ادھر کا رستہ بھول گیے ہیں۔۔۔ یا پھر یہ ہوسکتا ہے کہ۔۔۔" وہ اس کے آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔خدا بخش اور سلطانہ دونوں اس آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دستک ہوئی۔خدا بخش نے لپک کر دروازہ کھولا۔ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ یہ پہلا گاہک تھا جس سے تین روپے میں سودا طے ہوا۔اس کے بعد پانچ اور آئے یعنی تین مہینے میں چھ، جن سے سلطانہ نے صرف ساڑھے اٹھارہ روپے وصول کیے۔

بیس روپے ماہوار تو فلیٹ کے کرایہ میں چلے جاتے تھے، پانی کا ٹیکس اور بجلی کا بل جدا تھا۔

اس کے علاوہ گھر کے دوسرے خرچ تھے۔ کھانا پینا، کپڑے لتے، دوا دارو اور آمدن کچھ بھی نہیں تھی۔ ساڑھے اٹھارہ روپے تین مہینے میں آئے تو اسے آمدن تو نہیں کہہ سکتے۔ سلطانہ پریشان ہوگئی۔ ساڑھے پانچ تولے کی آٹھ کنگنیاں جو اس نے انبالے میں بنوائی تھیں آہستہ آہستہ بک گئیں۔ آخری کنگنی کی جب باری آئی تو اس نے خدا بخش سے کہا۔ ''تم میری سنو اور چلو واپس انبالے میں یہاں کیا دھرا ہے۔۔۔؟ بھئی ہوگا، پر ہمیں تو یہ شہر راس نہیں آیا۔ تمہارا کام بھی وہاں خوب چلتا تھا، چلو، وہیں چلتے ہیں۔ جو نقصان ہوا ہے اس کو اپنا سر صدقہ سمجھو۔ اس کنگنی کو بیچ کر آؤ، میں اسباب وغیرہ باندھ کر تیار رکھتی ہوں۔ آج رات کی گاڑی سے یہاں سے چل دیں گے۔''

خدا بخش نے کنگنی سلطانہ کے ہاتھ سے لے لی اور کہا ''نہیں جانِ من، انبالہ اب نہیں جائیں گے، یہیں دہلی میں رہ کر کمائیں گے۔ یہ تمہاری چوڑیاں سب کی سب یہیں واپس آئیں گی۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہ بڑا کارساز ہے۔ یہاں بھی وہ کوئی نہ کوئی اسباب بنا ہی دے گا۔''
سلطانہ چپ ہو رہی، چنانچہ آخری کنگنی ہاتھ سے اتر گئی۔ بُچے ہاتھ دیکھ کر اس کو بہت دکھ ہوتا تھا، پر کیا کرتی، پیٹ بھی تو آخر کسی حیلے سے بھرنا تھا۔

جب پانچ مہینے گزر گیے اور آمدن خرچ کے مقابلے میں چوتھائی سے بھی کچھ کم رہی تو سلطانہ کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ خدا بخش بھی سارا دن اب گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ سلطانہ کو اس کا بھی دکھ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پڑوس میں اس کی دو تین ملنے والیاں موجود تھیں جن کے ساتھ وہ اپنا وقت کاٹ سکتی تھی، پر ہر روز ان کے یہاں جانا اور گھنٹوں بیٹھے رہنا اس کو بہت برا لگتا تھا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ اس نے ان سہیلیوں سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا۔ سارا

دن وہ اپنے سنسنان مکان میں بیٹھی رہتی۔ کبھی چھالیا کاٹتی رہتی، کبھی اپنے پرانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کو سیتی رہتی اور کبھی باہر بالکونی میں آ کر جنگلے کے ساتھ کھڑی ہو جاتی اور سامنے ریلوے شیڈ میں ساکت اور متحرک انجنوں کی طرف گھنٹوں بے مطلب دیکھتی رہتی۔

سڑک کی دوسری طرف مال گودام تھا جو اس کونے سے اس کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ کو لوہے کی چھت کے نیچے بڑی بڑی گانٹھیں پڑی رہتی تھیں اور ہر قسم کے مال اسباب کے ڈھیر سے لگے رہتے تھے۔ بائیں ہاتھ کو کھلا میدان تھا جس میں بے شمار ریل کی پٹریاں بچھی ہوئی تھیں۔ دھوپ میں لوہے کی یہ پٹریاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹریوں کی طرح ابھری رہتی تھیں۔ اس لمبے اور کھلے میدان میں ہر وقت انجن اور گاڑیاں چلتی رہتی تھیں۔ کبھی ادھر کبھی ادھر۔ ان انجنوں اور گاڑیوں کی چھک چھک پھک پھک سدا گونجتی رہتی تھی۔

صبح سویرے جب وہ اٹھ کر بالکونی میں آتی تو ایک عجیب سماں نظر آتا۔ دھند لکے میں انجنوں کے منہ سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلتا تھا اور گدلے آسمان کی جانب موٹے اور بھاری آدمیوں کی طرح اُٹھتا دکھائی دیتا تھا۔ بھاپ کے بڑے بڑے بادل بھی ایک شور کے ساتھ پٹریوں سے اُٹھتے تھے اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہوا کے اندر گھل مل جاتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑی کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو، اکیلے پٹریوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹری پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود جا رہی ہے۔ دوسرے لوگ کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے۔۔۔ نہ جانے کہاں۔ پھر ایک روز ایسا آئے گا جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا اور وہ

کہیں رک جائے گی۔۔۔کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہو گا۔
یوں تو وہ بے مطلب گھنٹوں ریل کی ان ٹیڑھی بانکی پٹریوں اور ٹھہرے اور چلتے ہوئے انجنوں کی طرف دیکھتی رہتی تھی، پر طرح طرح کے خیال اس کے دماغ میں آتے رہتے تھے۔انبالہ چھاؤنی میں جب وہ رہتی تھی تو اسٹیشن کے پاس ہی اس کا مکان تھا مگر وہاں اس نے کبھی ان چیزوں کو ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔اب تو کبھی کبھی اس کے دماغ میں یہ بھی خیال آتا کہ یہ جو سامنے ریل کی پٹریوں کا جال سا بچھا ہے اور جگہ جگہ سے بھاپ اور دھواں اٹھ رہا ہے ایک بہت بڑا چکلہ ہے۔بہت سی گاڑیاں ہیں جن کو چند موٹے موٹے انجن ادھر ادھر دھکیلتے رہتے ہیں۔سلطانہ کو تو بعض اوقات یہ انجن سیٹھ معلوم ہوتے ہیں جو کبھی کبھی انبالہ میں اس کے ہاں آیا کرتے تھے۔پھر کبھی کبھی جب وہ کسی انجن کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گزرتا دیکھتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی آدمی چکلے کے کسی بازار میں سے اوپر کوٹھوں کی طرف دیکھتا جا رہا ہے۔

سلطانہ سمجھتی تھی کہ ایسی باتیں سوچنا دماغ کی خرابی کا باعث ہے، چنانچہ جب اس قسم کے خیال اس کو آنے لگے تو اس نے بالکونی میں جانا چھوڑ دیا۔خدا بخش سے اس نے بارہا کہا،"دیکھو، میرے حال پر رحم کرو۔ یہاں گھر میں رہا کرو۔میں سارا دن یہاں بیماروں کی طرح پڑی رہتی ہوں۔"مگر اس نے ہر بار سلطانہ سے یہ کہہ کر اس کی تشفی کر دی،"جانِ من۔۔۔میں باہر کچھ کمانے کی فکر کر رہا ہوں۔اللہ نے چاہا تو چند دنوں ہی میں بیڑا پار ہو جائے گا۔"
پورے پانچ مہینے ہو گئے تھے مگر ابھی تک نہ سلطانہ کا بیڑا پار ہوا تھا نہ خدا بخش کا۔

محرم کا مہینہ سر پر آرہا تھا مگر سلطانہ کے پاس کالے کپڑے بنوانے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔مختار

نے لیڈی ہیملٹن کی ایک نئی وضع کی قمیص بنوائی تھی جس کی آستینیں کالی جارجٹ کی تھیں۔ اس کے ساتھ میچ کرنے کے لیے اس کے پاس کالی ساٹن کی شلوار تھی جو کاجل کی طرح چمکتی تھی۔ انوری نے ریشمی جارجٹ کی ایک بڑی نفیس ساڑی خریدی تھی۔ اس نے سلطانہ سے کہا تھا کہ وہ اس ساڑی کے نیچے سفید بوسکی کا پیٹی کوٹ پہنے گی کیونکہ یہ نیا فیشن ہے۔ اس ساڑی کے ساتھ پہننے کو انوری کالی مخمل کا ایک جوتا لائی تھی جو بڑا نازک تھا۔ سلطانہ نے جب یہ تمام چیزیں دیکھیں تو اس کو اس احساس نے بہت دکھ دیا کہ وہ محرم منانے کے لیے ایسا لباس خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔

انوری اور مختار کے پاس یہ لباس دیکھ کر جب وہ گھر آئی تو اس کا دل بہت مغموم تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پھوڑا سا اس کے اندر پیدا ہو گیا ہے۔ گھر بالکل خالی تھا۔ خدا بخش حسبِ معمول باہر تھا۔ دیر تک وہ دری پر گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹی رہی، پر جب اس کی گردن اونچائی کے باعث اکڑ سی گئی تو اٹھ کر باہر بالکونی میں چلی گئی تاکہ غم افزا خیالات کو اپنے دماغ میں سے نکال دے۔

سامنے پٹریوں پر گاڑیوں کے ڈبے کھڑے تھے پر انجن کوئی بھی نہ تھا۔ شام کا وقت تھا۔ چھڑکاؤ ہو چکا تھا اس لیے گرد و غبار دب گیا تھا۔ بازار میں ایسے آدمی چلنے شروع ہو گیے تھے جو تاک جھانک کرنے کے بعد چپ چاپ گھروں کا رخ کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک آدمی نے گردن اونچی کر کے سطانہ کی طرف دیکھا۔ سلطانہ مسکرا دی اور اس کو بھول گئی کیونکہ اب سامنے پٹریوں پر ایک انجن نمودار ہو گیا تھا۔

سلطانہ نے غور سے اس کی طرف دیکھنا شروع کیا اور آہستہ آہستہ یہ خیال اس کے دماغ میں

آیا کہ انجن نے بھی کالا لباس پہن رکھا ہے۔ یہ عجیب وغریب خیال دماغ سے نکالنے کی خاطر جب اس نے سڑک کی جانب دیکھا تو اسے وہی آدمی بیل گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا جس نے اس کی طرف للچائی نظروں سے دیکھا تھا۔ سلطانہ نے ہاتھ سے اسے اشارہ کیا۔ اس آدمی نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک لطیف اشارے سے پوچھا، کدھر سے آؤں، سلطانہ نے اسے راستہ بتادیا۔ وہ آدمی تھوڑی دیر کھڑا رہا مگر پھر بڑی پھرتی سے اوپر چلا آیا۔

سلطانہ نے اسے دری پر بٹھایا۔ جب وہ بیٹھ گیا تو اس نے سلسلہ گفتگو شروع کرنے کے لیے کہا، ''آپ اوپر آتے ڈر رہے تھے۔'' وہ آدمی یہ سن کر مسکرایا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا۔۔۔ڈرنے کی بات ہی کیا تھی؟'' اس پر سلطانہ نے کہا، ''یہ میں نے اس لیے کہا کہ آپ دیر تک وہیں کھڑے رہے اور پھر کچھ سوچ کر ادھر آئے۔'' وہ یہ سن کر پھر مسکرایا۔ ''تمہیں غلط فہمی ہوئی۔ میں تمہارے اوپر والے فلیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں کوئی عورت کھڑی ایک مرد کو ٹھینگا دکھا رہی تھی۔ مجھے یہ منظر پسند آیا۔ پھر بالکونی میں سبز بلب روشن ہوا تو میں کچھ دیر کے لیے ٹھہر گیا۔ سبز روشنی مجھے پسند ہے۔ آنکھوں کو بہت اچھی لگتی ہے۔'' یہ کہہ اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سلطانہ نے پوچھا، ''آپ جا رہے ہیں؟'' اس آدمی نے جواب دیا، ''نہیں، میں تمہارے اس مکان کو دیکھنا چاہتا ہوں۔۔۔چلو مجھے تمام کمرے دکھاؤ۔''

سلطانہ نے اس کو تینوں کمرے ایک ایک کر کے دکھا دیے۔ اس آدمی نے بالکل خاموشی سے ان کمروں کا معائنہ کیا۔ جب وہ دونوں پھر اسی کمرے میں آگئے جہاں پہلے بیٹھے تھے تو اس آدمی نے کہا، ''میرا نام شنکر ہے۔''

سلطانہ نے پہلی بار غور سے شنکر کی طرف دیکھا۔ وہ متوسط قد کا معمولی شکل وصورت کا آدمی تھا مگر

اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر صاف اور شفاف تھیں۔ کبھی کبھی ان میں ایک عجیب قسم کی چمک بھی پیدا ہوتی تھی۔ گٹھیلا اور کسرتی بدن تھا۔ کنپٹیوں پر اس کے بال سفید ہو رہے تھے۔ خاکستری رنگ کی گرم پتلون پہنے تھا۔ سفید قمیص تھی جس کا کالر گردن پر سے اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ شنکر کچھ اس طرح دری پر بیٹھا تھا کہ معلوم ہوتا تھا شنکر کے بجائے سلطانہ گاہک ہے۔ اس احساس نے سلطانہ کو قدرے پریشان کر دیا۔ چنانچہ اس نے شنکر سے کہا ''فرمائیے۔۔۔''

شنکر بیٹھا تھا، یہ سن کر لیٹ گیا۔ ''میں کیا فرماؤں، کچھ تم ہی فرماؤ۔ بلایا تمہیں نے ہے مجھے۔''

جب سلطانہ کچھ نہ بولی تو وہ اٹھ بیٹھا۔ ''میں سمجھا، لو اب مجھ سے سنو، جو کچھ تم نے سمجھا، غلط ہے، میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو کچھ دے کر جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی طرح میری بھی فیس ہے۔ مجھے جب بلایا جائے تو فیس دینا ہی پڑتی ہے۔''

سلطانہ یہ سن کر چکرا گئی مگر اس کے باوجود اسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

''آپ کام کیا کرتے ہیں؟''

شنکر نے جواب دیا ''یہی جو تم لوگ کرتے ہو۔''

''کیا؟''

''تم کیا کرتی ہو؟''

''میں۔۔۔میں۔۔۔میں کچھ بھی نہیں کرتی۔''

''میں بھی کچھ نہیں کرتا۔''

سلطانہ نے بھنا کر کہا ''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔۔۔آپ کچھ نہ کچھ تو ضرور کرتے ہوں گے۔''

شنکر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا،''تم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرتی ہوگی۔''
''جھک مارتی ہوں۔''

''میں بھی جھک مارتا ہوں۔''
''تو آؤ دونوں جھک ماریں۔''

''میں حاضر ہوں مگر جھک مارنے کے لیے دام میں کبھی نہیں دیا کرتا۔''
''ہوش کی دوا کرو۔۔۔یہ لنگر خانہ نہیں۔''

''اور میں بھی والنٹیر نہیں ہوں۔''
سلطانہ یہاں رک گئی۔اس نے پوچھا''یہ والنٹیر کون ہوتے ہیں۔''

شنکر نے جواب دیا،''الو کے پٹھے۔''
''میں بھی الو کی پٹھی نہیں۔''

''مگر وہ آدمی خدا بخش جو تمہارے ساتھ رہتا ہے ضرور الو کا پٹھا ہے۔''
''کیوں؟''

''اس لیے کہ وہ کئی دنوں سے ایک ایسے خدا رسیدہ فقیر کے پاس اپنی قسمت کھلوانے کی خاطر جارہا ہے جس کی اپنی قسمت زنگ لگے تالے کی طرح بند ہے۔''یہ کہہ کر شنکر ہنسا۔
اس پر سلطانہ نے کہا،''تم ہندو ہو،اسی لیے ہمارے ان بزرگوں کا مذاق اڑاتے ہو۔''

شنکر مسکرایا،''ایسی جگہوں پر ہندو مسلم سوال پیدا نہیں ہوا کرتے۔ بڑے بڑے پنڈت اور مولوی اگر یہاں آئیں تو وہ بھی شریف آدمی بن جائیں۔''

''جانے تم کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہو۔۔۔ بولو رہو گے؟''

''اسی شرط پر جو پہلے بتا چکا ہوں۔''

سلطانہ اٹھ کھڑی ہوئی۔''تو جاؤ رستہ پکڑو۔''

شنکر آرام سے اٹھا۔ پتلون کی جیبوں میں اس نے اپنے دونوں ہاتھ ٹھونسے اور جاتے ہوئے کہا،''میں کبھی کبھی اس بازار سے گزرا کرتا ہوں۔ جب بھی تمہیں میری ضرورت ہو بلا لینا۔۔۔ میں بہت کام کا آدمی ہوں۔''

شنکر چلا گیا اور سلطانہ کالے لباس کو بھول کر دیر تک اس کے متعلق سوچتی رہی۔ اس آدمی کی باتوں نے اس کے دکھ کو بہت ہلکا کر دیا تھا۔ اگر وہ انبالے میں آیا ہوتا جہاں کہ وہ خوشحال تھی تو اس نے کسی اور ہی رنگ میں اس آدمی کو دیکھا ہوتا اور بہت ممکن ہے کہ اسے دھکے دے کر باہر نکال دیا ہوتا مگر یہاں چونکہ وہ بہت اداس رہتی تھی، اس لیے شنکر کی باتیں اسے پسند آئیں۔

شام کو جب خدا بخش آیا تو سلطانہ نے اس سے پوچھا،''تم آج سارا دن کدھر غائب رہے ہو؟''
خدا بخش تھک کر چور چور ہو رہا تھا، کہنے لگا،''پرانے قلعہ کے پاس سے آ رہا ہوں۔ وہاں ایک بزرگ کچھ دنوں سے ٹھہرے ہوئے ہیں، انہی کے پاس ہر روز جاتا ہوں کہ ہمارے دن پھر جائیں۔۔۔''

"کچھ انھوں نے تم سے کہا؟"

"نہیں، ابھی وہ مہربان نہیں ہوئے۔۔۔ پر سلطانہ، میں جوان کی خدمت کر رہا ہوں وہ اکارت کبھی نہیں جائے گی۔ اللہ کا فضل شامل حال رہا تو ضرور وارے نیارے ہو جائیں گے۔"
سلطانہ کے دماغ میں محرم منانے کا خیال سمایا ہوا تھا، خدا بخش سے رونی آواز میں کہنے لگی، "سارا سارا دن باہر غائب رہتے ہو۔۔۔ میں یہاں پنجرے میں قید رہتی ہوں، نہ کہیں جا سکتی ہوں نہ آ سکتی ہوں۔ محرم سر پر آ گیا ہے، کچھ تم نے اس کی بھی فکر کی کہ مجھے کالے کپڑے چاہئیں، گھر میں پھوٹی کوڑی تک نہیں۔ کنگنیاں تھیں سو وہ ایک ایک کر کے بک گئیں، اب تم ہی بتاؤ کیا ہو گا؟۔۔۔ یوں فقیروں کے پیچھے کب تک مارے مارے پھرا کرو گے۔ مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہاں دہلی میں خدا نے بھی ہم سے منہ موڑ لیا ہے۔ میری سنو تو اپنا کام شروع کر دو۔ کچھ تو سہارا ہو ہی جائے گا۔"

خدا بخش دری پر لیٹ گیا اور کہنے لگا، "پر یہ کام شروع کرنے کے لیے بھی تو تھوڑا بہت سرمایہ چاہیے۔۔۔ خدا کے لیے اب ایسی دکھ بھری باتیں نہ کرو۔ مجھ سے اب برداشت نہیں ہو سکتیں۔ میں نے سچ مچ انبالہ چھوڑنے میں سخت غلطی کی، پر جو کرتا ہے اللہ ہی کرتا ہے اور ہماری بہتری ہی کے لیے کرتا ہے، کیا پتا ہے کہ کچھ دیر اور تکلفیں برداشت کرنے کے بعد ہم۔۔۔"
سلطانہ نے بات کاٹ کر کہا، "تم خدا کے لیے کچھ کرو۔ چوری کرو یا ڈاکہ مارو پر مجھے ایک شلوار کا کپڑا ضرور لا دو۔ میرے پاس سفید بوسکی کی قمیص پڑی ہے، اس کو میں رنگوا لوں گی۔ سفید نینون کا ایک نیا دوپٹہ بھی میرے پاس موجود ہے، وہی جو تم نے مجھے دیوالی پر لا کر دیا تھا،

یہ بھی قمیص کے ساتھ ہی کالا رنگوالیا جائے گا۔ایک صرف شلوار کی کسر ہے،سو وہ تم کسی نہ کسی طرح پیدا کردو۔۔۔دیکھو تمہیں میری جان کی قسم کسی نہ کسی طرح ضرور لادو۔۔۔میری بھتی کھاؤ اگر نہ لاؤ۔''

خدا بخش اٹھ بیٹھا۔''اب تم خواہ مخواہ زور دیے چلی جارہی ہو۔۔۔میں کہاں سے لاؤں گا۔۔۔افیم کھانے کے لیے تو میرے پاس پیسہ نہیں۔''
''کچھ بھی کرو مگر مجھے ساڑھے چار گز کالی ساٹن لادو۔''

''دعا کرو کہ آج رات ہی اللہ دو تین آدمی بھیج دے۔''
''لیکن تم کچھ نہیں کرو گے۔۔۔تم اگر چاہو تو ضرور اتنے پیسے پیدا کرسکتے ہو۔جنگ سے پہلے یہ ساٹن بارہ چودہ آنہ گز مل جاتی تھی،اب سوا روپے گز کے حساب سے ملتی ہے۔ساڑھے چار گزوں پر کتنے روپے خرچ ہو جائیں گے؟''

''اب تم کہتی ہو تو میں کوئی حیلہ کروں گا۔'' یہ کہہ کر خدا بخش اٹھا۔''لو اب ان باتوں کو بھول جاؤ،میں ہوٹل سے کھانا لے آؤں۔''
ہوٹل سے کھانا آیا دونوں نے مل کر زہر مار کیا اور سو گیے۔صبح ہوئی۔خدا بخش پرانے قلعے والے فقیر کے پاس چلا گیا اور سلطانہ اکیلی رہ گئی۔کچھ دیر لیٹی رہی،کچھ دیر سوئی رہی۔ادھر ادھر کمروں میں ٹہلتی رہی،دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنا سفید نینون کا دوپٹہ اور سفید بوسکی کی قمیص نکالی اور نیچے لانڈری والے کو رنگنے کے لیے دے آئی۔کپڑے دھونے کے علاوہ وہاں رنگنے کا کام بھی ہوتا تھا۔یہ کام کرنے کے بعد اس نے واپس آکر فلموں کی کتابیں

پڑھیں جن میں اس کی دیکھی ہوئی فلموں کی کہانی اور گیت چھپے ہوئے تھے۔ یہ کتابیں پڑھتے پڑھتے وہ سوگئی، جب اٹھی تو چار بج چکے تھے کیونکہ دھوپ آنگن میں سے موری کے پاس پہنچ چکی تھی۔ نہا دھو کر فارغ ہوئی تو گرم چادر اوڑھ کر بالکونی میں آ کھڑی ہوئی۔ قریباً ایک گھنٹہ سلطانہ بالکونی میں کھڑی رہی۔

اب شام ہوگئی تھی۔ بتیاں روشن ہو رہی تھیں۔ نیچے سڑک میں رونق کے آثار نظر آنے لگے۔ سردی میں تھوڑی سی شدت ہوگئی تھی مگر سلطانہ کو یہ ناگوار معلوم نہ ہوئی۔ وہ سڑک پر آتے جاتے ٹانگوں اور موٹروں کی طرف ایک عرصہ سے دیکھ رہی تھی۔ دفعتاً اسے شنکر نظر آیا۔ مکان کے نیچے پہنچ کر اس نے گردن اونچی کی اور سلطانہ کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ سلطانہ نے غیر ارادی طور پر ہاتھ کا اشارہ کیا اور اسے اوپر بلا لیا۔
جب شنکر اوپر آگیا تو سلطانہ بہت پریشان ہوئی کہ اس سے کیا کہے۔ دراصل اس نے ایسے ہی بلا سوچے سمجھے اسے اشارہ کر دیا تھا۔ شنکر بے حد مطمئن تھا جیسے اس کا اپنا گھر ہے، چنانچہ بڑی بے تکلفی سے پہلے روز کی طرح وہ گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ جب سلطانہ نے دیر تک اس سے کوئی بات نہ کی تو اس سے کہا ”تم مجھے سو دفعہ بلا سکتی ہو اور سو دفعہ ہی کہہ سکتی ہو کہ چلے جاؤ۔۔۔ میں ایسی باتوں پر کبھی ناراض نہیں ہوا کرتا۔“

سلطانہ شش و پنج میں گرفتار ہوگئی، کہنے لگی ”نہیں بیٹھو، تمہیں جانے کو کون کہتا ہے۔“
شنکر اس پر مسکرا دیا۔ ”تو میری شرطیں تمہیں منظور ہیں۔“

”کیسی شرطیں؟“ سلطانہ نے ہنس کر کہا ”کیا نکاح کر رہے ہو مجھ سے؟“

''نکاح اور شادی کیسی؟ نہ تم عمر بھر میں کسی سے نکاح کرو گی نہ میں۔ یہ رسمیں ہم لوگوں کے لیے نہیں۔۔۔چھوڑو ان فضولیات کو۔کوئی کام کی بات کرو۔''

''بولو کیا بات کروں؟''

''تم عورت ہو۔۔۔کوئی ایسی بات شروع کرو جس سے دو گھڑی دل بہل جائے۔اس دنیا میں صرف دوکانداری ہی دوکانداری نہیں، اور کچھ بھی ہے۔''

سلطانہ ذہنی طور پر اب شنکر کو قبول کر چکی تھی۔کہنے لگی''صاف صاف کہو، تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔''

''جو دوسرے چاہتے ہیں۔''شنکر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''تم میں اور دوسروں میں پھر فرق ہی کیا رہا۔''

''تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ان میں اور مجھ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ایسی بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو پوچھنا نہیں چاہئیں خود سمجھنا چاہئیں۔''

سلطانہ نے تھوڑی دیر تک شنکر کی اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی پھر کہا''میں سمجھ گئی۔''

''تو کہو، کیا ارادہ ہے؟''

''تم جیتے، میں ہاری۔پر میں کہتی ہوں، آج تک کسی نے ایسی بات قبول نہ کی ہو گی۔''

''تم غلط کہتی ہو۔۔۔اسی محلے میں تمہیں ایسی سادہ لوح عورتیں بھی مل جائیں گی جو کبھی یقین نہیں کریں گی کہ عورت ایسی ذلت قبول کر سکتی ہے جو تم بغیر کسی احساس کے قبول کرتی رہی ہو۔لیکن ان کے نہ یقین کرنے کے باوجود تم ہزاروں کی تعداد میں موجود ہو۔۔۔تمہارا نام

سلطانہ ہے نا؟''

''سلطانہ ہی ہے۔''
شنکر اٹھ کھڑا ہوا اور ہنسنے لگا،''میرا نام شنکر ہے۔۔۔ یہ نام بھی عجب اوٹ پٹانگ ہوتے ہیں، چلو آؤ اندر چلیں۔''

شنکر اور سلطانہ دری والے کمرے میں واپس آئے تو دونوں ہنس رہے تھے، نہ جانے کس بات پر۔ جب شنکر جانے لگا تو سلطانہ نے کہا،''شنکر میری ایک بات مانو گے؟''
شنکر نے جواباً کہا،''پہلے بات بتاؤ۔''

سلطانہ کچھ جھینپ سی گئی،''تم کہو گے کہ میں دام وصول کرنا چاہتی ہوں مگر۔''
''کہو کہو۔۔۔ رک کیوں گئی ہو۔''

سلطانہ نے جرأت سے کام لے کر کہا،''بات یہ ہے کہ محرم آرہا ہے اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ میں کالی شلوار بنوا سکوں۔۔۔ یہاں کے سارے دکھڑے تو تم مجھ سے سن ہی چکے ہو۔ قمیص اور دوپٹہ میرے پاس موجود تھا جو میں نے آج رنگوانے کے لیے دے دیا ہے۔''
شنکر نے یہ سن کر کہا،''تم چاہتی ہو کہ میں تمہیں کچھ روپے دے دوں جو تم یہ کالی شلوار بنوا سکو۔''

سلطانہ نے فوراً ہی کہا،''نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ اگر ہو سکے تو تم مجھے ایک کالی شلوار لا دو۔''
شنکر مسکرایا،''میری جیب میں تو اتفاق ہی سے کبھی کچھ ہوتا ہے، بہر حال میں کوشش کروں گا۔ محرم کی پہلی تاریخ کو تمہیں یہ شلوار مل جائے گی۔ لے بس اب خوش ہو گئیں۔'' سلطانہ کے

بُندوں کی طرف دیکھ کر شنکر نے پوچھا ''کیا یہ بُندے تم مجھے دے سکتی ہو؟''

سلطانہ نے ہنس کر کہا ''تم انھیں کیا کرو گے۔ چاندی کے معمولی بُندے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پانچ روپے کے ہوں گے۔''
اس پر شنکر نے کہا ''میں نے تم سے بندے مانگے ہیں۔ ان کی قیمت نہیں پوچھی، بولو، دیتی ہو۔''

''لے لو۔'' یہ کہہ کر سلطانہ نے بُندے اتار کر شنکر کو دے دیے۔ اس کے بعد افسوس ہوا مگر شنکر جا چکا تھا۔
سلطانہ کو قطعاً یقین نہیں تھا کہ شنکر اپنا وعدہ پورا کرے گا مگر آٹھ روز کے بعد محرم کی پہلی تاریخ کو صبح نو بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا تو شنکر کھڑا تھا۔ اخبار میں لپٹی ہوئی چیز اس نے سلطانہ کو دی اور کہا ''ساٹن کی کالی شلوار ہے۔۔۔ دیکھ لینا، شاید لمبی ہو۔۔۔ اب میں چلتا ہوں۔''

شنکر شلوار دے کر چلا گیا اور کوئی بات اس نے سلطانہ سے نہ کی۔ اس کی پتلون میں شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی سو کر اٹھا ہے اور سیدھا ادھر ہی چلا آیا ہے۔ سلطانہ نے کاغذ کھولا۔ ساٹن کی کالی شلوار تھی ایسی ہی جیسی کہ وہ مختار کے پاس دیکھ کر آئی تھی۔ سلطانہ بہت خوش ہوئی۔ بندوں اور اس سودے کا جو افسوس اسے ہوا تھا اس شلوار نے اور شنکر کی وعدہ ایفائی نے دور کر دیا۔
دوپہر کو وہ نیچے لانڈری والے سے اپنی رنگی ہوئی قمیص اور دوپٹہ لے کر آئی۔ تینوں کالے

کپڑے اس نے جب پہن لیے تو دروازے پر دستک ہوئی۔سلطانہ نے دروازہ کھولا تو مختار اندر داخل ہوئی۔اس نے سلطانہ کے تینوں کپڑوں کی طرف دیکھا اور کہا،"قمیص اور دوپٹہ تو رنگا ہوا معلوم ہوتا ہے، پر یہ شلوار نئی ہے۔۔۔کب بنوائی؟"

سلطانہ نے جواب دیا،"آج ہی درزی لایا ہے۔"یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں مختار کے کانوں پر پڑیں،"یہ بُندے تم نے کہاں سے لیے؟"

مختار نے جواب دیا،"آج ہی منگوائے ہیں۔"

اس کے بعد دونوں کو تھوڑی دیر تک خاموش رہنا پڑا۔

❁❁❁

ٹھنڈا گوشت

ایشر سنگھ جونہی ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوا، کلونت کور پلنگ پر سے اٹھی۔ اپنی تیز تیز آنکھوں سے اس کی طرف گھور کے دیکھا اور دروازے کی چٹخنی بند کر دی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے، شہر کا مضافات ایک عجیب پراسرار خاموشی میں غرق تھا۔
کلونت کور پلنگ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ ایشر سنگھ جو غالباً اپنے پراگندہ خیالات کے الجھے ہوئے دھاگے کھول رہا، ہاتھ میں کرپان لیے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ چند لمحات اسی طرح خاموشی میں گزر گیے۔ کلونت کور کو تھوڑی دیر کے بعد اپنا آسن پسند نہ آیا، اور وہ دونوں ٹانگیں پلنگ سے نیچے لٹکا کر ہلانے لگی۔ ایشر سنگھ پھر بھی کچھ نہ بولا۔

کلونت کور بھرے بھرے ہاتھ پیروں والی عورت تھی۔ چوڑے چکلے کولہے، تھل تھل کرنے والے گوشت سے بھرپور کچھ بہت ہی زیادہ اوپر کو اٹھا ہوا سینہ، تیز آنکھیں، بالائی ہونٹ پر بالوں کا سرمئی غبار، ٹھوڑی کی ساخت سے پتہ چلتا تھا کہ بڑے دھڑلے کی عورت ہے۔
ایشر سنگھ گو سر نیوڑھائے ایک کونے میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ سر پر اس کی کس کر باندھی ہوئی پگڑی ڈھیلی ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ جو کرپان تھامے ہوئے تھے، تھوڑے تھوڑے لرزاں تھے، مگر اس کے قد و قامت اور خد و خال سے پتہ چلتا تھا کہ کلونت کور جیسی عورت کے لیے موزوں ترین مرد ہے۔

چند اور لمحات جب اسی طرح خاموشی سے گزر گئے تو کلونت کور چھلک پڑی۔ لیکن تیز تیز آنکھوں کو نچا کر وہ صرف اس قدر کہہ سکی، ''ایشر سیاں۔'' ایشر سنگھ نے گردن اٹھا کر کلونت کور

کی طرف دیکھا، مگر اس کی نگاہوں کی گولیوں کی تاب نہ لا کرمنہ دوسری طرف موڑ لیا۔ کلونت کور چلائی، ''ایشر سیاں۔''لیکن فوراً ہی آواز بھینچ لی اور پلنگ پر سے اٹھ کراس کی جانب جاتے ہوئے بولی، ''کہاں رہے تم اتنے دن؟''

ایشر سنگھ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔''مجھے معلوم نہیں۔''

کلونت کور بھناگئی۔''یہ بھی کوئی مویا جواب ہے؟''

ایشر سنگھ نے کرپان ایک طرف پھینک دی اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کئی دنوں کا بیمار ہے۔کلونت کور نے پلنگ کی طرف دیکھا۔جواب ایشر سنگھ سے لبالب بھرا تھا۔ اس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ چنانچہ اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کراس نے بڑے پیار سے پوچھا، ''جانی کیا ہوا ہے تمہیں؟''

ایشر سنگھ چھت کی طرف دیکھ رہا تھا، اس سے نگاہیں ہٹا کر اس نے کلونت کور کے مانوس چہرے کوٹٹولنا شروع کیا۔''کلونت''

آواز میں درد تھا۔کلونت کور ساری کی ساری سمٹ کر اپنے بالائی ہونٹ میں آ گئی۔''ہاں جانی'' کہہ کر وہ اس کو دانتوں سے کاٹنے لگی۔

ایشر سنگھ نے پگڑی اتار دی۔کلونت کور کی طرف سہارا لینے والی نگاہوں سے دیکھا، اس کے گوشت بھرے کولھے پر زور سے دھپا مارا اور سر کو جھٹکا دے کر اپنے آپ سے کہا، ''یہ کڑی یا دماغ ہی خراب ہے۔''

جھٹکا دینے سے اس کے کیس کھل گیے۔کلونت کور انگلیوں سے ان میں کنگھی کرنے لگی۔ایسا

کرتے ہوئے اس نے بڑے پیار سے پوچھا،''ایشر سیاں، کہاں رہے تم اتنے دن؟''

''برے کی ماں کے گھر'' ایشر سنگھ نے کلونت کور کو گھور کے دیکھا اور دفعتاً دونوں ہاتھوں سے اس کے ابھرے ہوئے سینے کو مسلنے لگا۔
''قسم واہگورو کی بڑی جاندار عورت ہے۔''

کلونت کور نے ایک ادا کے ساتھ ایشر سنگھ کے ہاتھ ایک طرف جھٹک دیے اور پوچھا،''تمہیں میری قسم بتاؤ، کہاں رہے۔۔۔؟ شہر گیے تھے؟''
ایشر سنگھ نے ایک ہی لپیٹ میں اپنے بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے جواب دیا،''نہیں۔''

کلونت کور چڑ گئی۔''نہیں تم ضرور شہر گیے تھے۔۔۔اور تم نے بہت سا روپیہ لوٹا ہے جو مجھ سے چھپا رہے ہو۔''
''وہ اپنے باپ کا تخم نہ ہو جو تم سے جھوٹ بولے۔''

کلونت کور تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی، لیکن فوراً ہی بھڑک اٹھی،''لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا، اس رات تمہیں کیا ہوا۔۔۔؟ اچھے بھلے میرے ساتھ لیٹے تھے، مجھے تم نے وہ تمام گہنے پہنا رکھے تھے جو تم شہر سے لوٹ کر لائے تھے۔ میری بھپیاں لے رہے تھے، پر جانے ایک دم تمہیں کیا ہوا، اٹھے اور کپڑے پہن کر باہر نکل گیے۔''
ایشر سنگھ کا رنگ زرد ہو گیا۔ کلونت کور نے یہ تبدیلی دیکھتے ہی کہا،''دیکھا کیسے رنگ نیلا پڑ گیا۔۔۔ایشر سیاں، قسم واہگورو کی، ضرور کچھ دال میں کالا ہے؟''
''تیری جان کی قسم کچھ بھی نہیں۔''

ایشر سنگھ کی آواز بے جان تھی۔کلونت کور کا شبہ اور زیادہ مضبوط ہوگیا، بالائی ہونٹ بھینچ کر اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا،''ایشر سیاں، کیا بات ہے۔تم وہ نہیں ہو جو آج سے آٹھ روز پہلے تھے؟''

ایشر سنگھ ایک دم اٹھ بیٹھا، جیسے کسی نے اس پر حملہ کیا تھا۔کلونت کور کو اپنے تنومند بازوؤں میں سمیٹ کر اس نے پوری قوت کے ساتھ اسے بھنبھوڑنا شروع کر دیا۔''جانی میں وہی ہوں۔۔۔گھٹ گھٹ پا جپھیاں، تیری نکلے ہڈاں دی گرمی۔۔۔''
کلونت کور نے مزاحمت نہ کی، لیکن وہ شکایت کرتی رہی۔''تمہیں اس رات ہو کیا گیا تھا؟''

''برے کی ماں کا وہ ہو گیا تھا۔''
''بتاؤ گے نہیں؟''

''کوئی بات ہو تو بتاؤں۔''
''مجھے اپنے ہاتھوں سے جلاؤ اگر جھوٹ بولو۔''

ایشر سنگھ نے اپنے بازو اس کی گردن میں ڈال دیے اور ہونٹ اس کے ہونٹوں میں گاڑ دیے۔مونچھوں کے بال کلونت کور کے نتھنوں میں گھسے تو اسے چھینک آگئی۔دونوں ہنسنے لگے۔ایشر سنگھ نے اپنی صدری اتار دی اور کلونت کور کو شہوت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا، ''آجاؤ، ایک بازی تاش کی ہو جائے!''
کلونت کور کے بالائی ہونٹ پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں پھوٹ آئیں، ایک ادا کے ساتھ اس نے اپنی آنکھوں کی پتلیاں گھمائیں اور کہا،''چل دفان ہو۔''

ایشر سنگھ نے اس کے بھرے ہوئے کولہے پر زور سے چٹکی بھری۔ کلونت کور تڑپ کر ایک طرف ہٹ گئی، ''نہ کر ایشر سیاں، میرے درد ہوتا ہے۔'' ایشر سنگھ نے آگے بڑھ کر کلونت کور کا بالائی ہونٹ اپنے دانتوں تلے دبالیا اور کچکچانے لگا۔ کلونت کور بالکل پگھل گئی۔ ایشر سنگھ نے اپنا کرتہ اتار کے پھینک دیا اور کہا ''لو، پھر ہو جائے ترپ چال۔۔۔''

کلونت کور کا بالائی ہونٹ کپکپانے لگا، ایشر سنگھ نے دونوں ہاتھوں سے کلونت کور کی قمیص کا گھیرا پکڑا اور جس طرح بکرے کی کھال اتارتے ہیں، اسی طرح اس کو اتار کر ایک طرف رکھ دیا، پھر اس نے گھور کے اس کے ننگے بدن کو دیکھا اور زور سے اس کے بازو پر چٹکی بھرتے ہوئے کہا، ''کلونت، قسم واہگورو کی، بڑی کراری عورت ہے تو۔'' کلونت کور اپنے بازو پر ابھرتے ہوئے لال دھبے کو دیکھنے لگی، ''بڑا ظالم ہے تو ایشر سیاں۔''

ایشر سنگھ اپنی گھنی کالی مونچھوں میں مسکرایا، ''ہونے دے آج ظلم؟'' اور یہ کہہ کر اس نے مزید ظلم ڈھانے شروع کیے۔ کلونت کور کا بالائی ہونٹ دانتوں تلے کچکچایا۔ کان کی لووں کو کاٹا، ابھرے ہوئے سینے کو بھنبھوڑا، ابھرے ہوئے کولہوں پر آواز پیدا کرنے والے چانٹے مارے۔ گالوں کے منہ بھر بھر کے بوسے لیے۔ چوس چوس کر اس کا سارا سینہ تھوکوں سے لتھیڑ دیا۔ کلونت کور تیز آنچ پر چڑھی ہوئی ہانڈی کی طرح ابلنے لگی۔

لیکن ایشر سنگھ ان تمام حیلوں کے باوجود خود میں حرارت پیدا نہ کر سکا۔ جتنے گر اور جتنے داؤ اسے یاد تھے، سب کے سب اس نے پٹ جانے والے پہلوان کی طرح استعمال کر دیے، پر کوئی کارگر نہ ہوا۔ کلونت کور نے، جس کے بدن کے سارے تار تن کر خود بخود بج رہے تھے، غیر ضروری چھیڑ چھاڑ سے تنگ آ کر کہا ''ایشر سیاں، کافی پھینٹ چکا ہے، اب پتا پھینک!''

یہ سنتے ہی ایشر سنگھ کے ہاتھ سے جیسے تاش کی ساری گڈی نیچے پھسل گئی۔ ہانپتا ہوا وہ کلونت کور کے پہلو میں لیٹ گیا اور اس کے ماتھے پر سرد پسینے کے لیپ ہونے لگے۔ کلونت کور نے اسے گرمانے کی بہت کوشش کی۔ مگر ناکام رہی، اب تک سب کچھ منہ سے کہے بغیر ہوتا رہا تھا لیکن جب کلونت کور کے منتظر بہ عمل اعضا کو سخت ناامیدی ہوئی تو وہ جھلا کر پلنگ سے نیچے اتر گئی۔ سامنے کھونٹی پر چادر پڑی تھی، اس کو اتار کر اس نے جلدی جلدی اوڑھ کر اور نتھنے پھلا کر، بپھرے ہوئے لہجے میں کہا ”ایشر سیاں، وہ کون حرام زادی ہے، جس کے پاس تو اتنے دن رہ کر آیا ہے۔ جس نے تجھے نچوڑ ڈالا ہے؟“ ایشر سنگھ پلنگ پر لیٹا ہانپتا رہا اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

کلونت کور غصے سے ابلنے لگی۔ ”میں پوچھتی ہوں؟ کون ہے چڑو۔۔۔کون ہے وہ الفتی۔۔۔ کون ہے وہ چور پتا؟“

ایشر سنگھ نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا ”کوئی بھی نہیں کلونت، کوئی بھی نہیں۔“

کلونت کور نے اپنے بھرے ہوئے کولھوں پر ہاتھ رکھ کر ایک عزم کے ساتھ کہا ”ایشر سیاں، میں آج جھوٹ سچ جان کے رہوں گی۔۔۔کھاوا ہگورو جی کی قسم۔۔۔کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں؟“

ایشر سنگھ نے کچھ کہنا چاہا، مگر کلونت کور نے اس کی اجازت نہ دی۔ ”قسم کھانے سے پہلے سوچ لے کہ میں سردار نہال سنگھ کی بیٹی ہوں۔۔۔تکا بوٹی کر دوں گی، اگر تو نے جھوٹ بولا۔۔۔لے اب کھاوا ہگورو جی کی قسم۔۔۔کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں؟“

ایشر سنگھ نے بڑے دکھ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا، کلونت کور بالکل دوانی ہوگئی۔ لپک کر

کونے میں سے کرپان اٹھائی، میان کو کیلے کے چھلکے کی طرح اتار کر ایک طرف پھینکا اور ایشر سنگھ پر وار کر دیا۔آن کی آن میں لہو کے فوارے چھوٹ پڑے ۔کلونت کور کی اس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو اس نے وحشی بلیوں کی طرح ایشر سنگھ کے کیس نوچنے شروع کر دیے ۔ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی نامعلوم سوت کو موٹی موٹی گالیاں دیتی رہیں ۔ایشر سنگھ نے تھوڑی دیر کے بعد نقاہت بھری التجا کی،''جانے دے اب کلونت! جانے دے۔''

آواز میں بلا کا درد تھا،کلونت کور پیچھے ہٹ گئی۔

خون، ایشر سنگھ کے گلے سے اڑ اڑ کر اس کی مونچھوں پر گر رہا تھا، اس نے اپنے لرزاں ہونٹ کھولے اور کلونت کور کی طرف شکریے اور گلے کی ملی جلی نگاہوں سے دیکھا۔''میری جان! تم نے بہت جلدی کی۔۔۔لیکن جو ہوا ٹھیک ہے۔''

کلونت کور کا حسد پھر بھڑکا۔''مگر وہ کون ہے تمہاری ماں؟''

لہو، ایشر سنگھ کی زبان تک پہنچ گیا، جب اس نے اس کا ذائقہ چکھا تو اس کے بدن پر جھرجھری سی دوڑ گئی۔

''اور میں ۔۔۔اور میں۔۔۔بھینی یا چھ آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں۔۔۔اسی کرپان سے۔۔۔''

کلونت کور کے دماغ میں صرف دوسری عورت تھی۔''میں پوچھتی ہوں، کون ہے وہ حرام زادی؟''

ایشر سنگھ کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں، ایک ہلکی سی چمک ان میں پیدا ہوئی اور اس نے کلونت کور سے کہا،''گالی نہ دے اس بھڑوی کو۔''

کلونت چلائی،”میں پوچھتی ہوں، وہ ہے کون؟“

ایشر سنگھ کے گلے میں آواز رندھ گئی۔”بتا تا ہوں۔“یہ کہہ کر اس نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا اور اس پر اپنا جیتا جیتا خون دیکھ کر مسکرایا۔”انسان ماں یا بھی ایک عجیب چیز ہے۔“
کلونت کور اس کے جواب کی منتظر تھی۔”ایشر سیاں، تو مطلب کی بات کر۔“

ایشر سنگھ کی مسکراہٹ اس کی لہو بھری مونچھوں میں اور زیادہ پھیل گئی۔”مطلب ہی کی بات کر رہا ہوں۔۔۔گلا چرا ہے ماں یا میرا۔۔۔اب دھیرے دھیرے ہی ساری بات بتاؤں گا۔“
اور جب وہ بات بنانے لگا تو اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پسینے کے لیپ ہونے لگے۔

”کلونت! میری جان۔۔۔میں تمہیں نہیں بتا سکتا، میرے ساتھ کیا ہوا۔۔۔؟ انسان کڑی یا بھی ایک عجیب چیز ہے۔۔۔شہر میں لوٹ مچی تو سب کی طرح میں نے بھی اس میں حصہ لیا۔۔۔گہنے پاتے اور روپے پیسے جو بھی ہاتھ لگے وہ میں نے تمہیں دے دیے۔۔۔لیکن ایک بات تمہیں نہ بتائی۔“
ایشر سنگھ نے گھاؤ میں درد محسوس کیا اور کراہنے لگا۔ کلونت کور نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ اور بڑی بے رحمی سے پوچھا۔”کون سی بات؟“

ایشر سنگھ نے مونچھوں پر جمتے ہوئے لہو کو پھونک کے ذریعے سے اڑاتے ہوئے کہا،”جس مکان پر۔۔۔میں نے دھاوا بولا تھا۔۔۔اس میں سات۔۔۔اس میں سات آدمی تھے۔۔۔چھ میں نے۔۔۔قتل کر دیے۔۔۔اسی کرپان سے جس سے تو نے مجھے۔۔۔چھوڑ اسے۔۔۔سن۔۔۔ایک لڑکی تھی بہت سندر۔۔۔اس کو اٹھا میں اپنے ساتھ لے آیا۔“

کلونت کور، خاموش سنتی رہی۔ ایشر سنگھ نے ایک بار پھر پھونک مار کے مونچھوں پر سے لہو اڑایا۔"کلونت جانی، میں تم سے کیا کہوں، کتنی سندر تھی۔۔۔میں اسے بھی مار ڈالتا، پر میں نے کہا،"نہیں، ایشر سیاں، کلونت کور کے تو ہر روز مزے لیتا ہے، یہ میوہ بھی چکھ دیکھ۔"

کلونت کور نے صرف اس قدر کہا،"ہوں۔۔۔!"

"اور میں اسے کندھے پر ڈال کر چل دیا۔۔۔راستے میں۔۔۔کیا کہہ رہا تھا میں؟۔۔۔ہاں راستے میں۔۔۔نہر کی پٹری کے پاس، تھوہڑ کی جھاڑیوں تلے میں نے اسے لٹا دیا۔۔۔پہلے سوچا کہ پھینٹوں، لیکن پھر خیال آیا کہ نہیں۔۔۔"یہ کہتے کہتے ایشر سنگھ کی زبان سوکھ گئی۔

کلونت کور نے تھوک نگل کر اپنا حلق تر کیا اور پوچھا،"پھر کیا ہوا؟"
ایشر سنگھ کے حلق سے بمشکل یہ الفاظ نکلے،"میں نے۔۔۔میں نے پتا پھینکا۔۔۔لیکن۔۔۔لیکن۔"

اس کی آواز ڈوب گئی۔
کلونت کور نے اسے جھنجھوڑا : "پھر کیا ہوا؟"

ایشر سنگھ نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھولیں اور کلونت کور کے جسم کی طرف دیکھا، جس کی بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی۔"وہ۔۔۔وہ مری ہوئی تھی۔۔۔لاش تھی۔۔۔بالکل ٹھنڈا گوشت۔۔۔جانی مجھے اپنا ہاتھ دے۔۔۔"
کلونت کور نے اپنا ہاتھ ایشر سنگھ کے ہاتھ پر رکھا، جو برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا تھا۔

❀❀❀

بو

برسات کے یہی دن تھے۔کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے اسی طرح نہا رہے تھے۔ساگوان کے اس اسپرنگ دار پلنگ پر، جو اب کھڑکی کے پاس سے تھوڑا ادھر سرکا دیا گیا تھا، ایک گھاٹن لونڈیا رندھیر کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔

کھڑکی کے پاس باہر پیپل کے نہائے ہوئے پتے رات کے دودھیالے اندھیرے میں جھمکوں کی طرح تھرتھرا رہے تھے۔۔۔اور شام کے وقت جب دن بھر ایک انگریزی اخبار کی ساری خبریں اور اشتہار پڑھنے کے بعد، جب وہ بالکنی میں ذرا تفریح کی خاطر آ کھڑا ہوا تھا تو اس نے اس گھاٹن لڑکی کو، جو ساتھ والے رسیوں کے کارخانے میں کام کرتی تھی اور بارش سے بچنے کے لیے املی کے پیڑ کے نیچے کھڑی تھی، کھانس کھانس کر اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا اور اس کے بعد ہاتھ کے اشارے سے اوپر بلا لیا تھا۔

وہ کئی دن سے شدید قسم کی تنہائی محسوس کر رہا تھا۔جنگ کے باعث بمبئی کی تقریباً تمام کرسچین چھوکریاں جو سستے داموں مل جایا کرتی تھیں، عورتوں کی اگزالری فورس میں بھرتی ہو گئی تھیں، ان میں سے کئی ایک نے فورٹ کے علاقے میں ڈانس اسکول کھول لیے تھے جہاں صرف فوجی گوروں کو جانے کی اجازت تھی۔۔۔رندھیر بہت اداس ہو گیا تھا۔

اس کی اداسی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کرسچین چھوکریاں نایاب ہو گئی تھیں۔دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ فوجی گوروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مہذب، تعلیم یافتہ، صحت مند اور خوبصورت تھا،

صرف اس لیے اس پر قہوہ خانوں کے دروازے بند کر دیے گیے تھے کہ اس کی چمڑی سفید نہیں تھی۔

جنگ سے پہلے رندھیر ناگپاڑہ اور تاج ہوٹل کی کئی مشہور و معروف کرسچین لڑکیوں سے جسمانی تعلقات قائم کر چکا تھا۔ اسے بخوبی علم تھا کہ اس قسم کے تعلقات کی کرسچین لڑکوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ معلومات رکھتا تھا جن سے لڑکیاں فیشن کے طور پر رومانس لڑاتی ہیں اور بعد میں کسی چغد سے شادی کر لیتی ہیں۔
رندھیر نے محض دل ہی دل میں ہی ہیزل سے بدلہ لینے کی خاطر اس گھاٹن لڑکی کو اشارے سے اوپر بلایا تھا۔ ہیزل اس کے فلیٹ کے نیچے رہتی تھی اور ہر روز صبح وردی پہن کر کٹے ہوئے بالوں پر خاکی رنگ کی ٹوپی ترچھے زاویے سے جما کر باہر نکلتی تھی اور اس انداز سے چلتی تھی گویا فٹ پاتھ پر تمام جاننے والے اس کے قدموں کے آگے ٹاٹ کی طرح بچھتے چلے جائیں گے۔

رندھیر نے سوچا تھا کہ آخر کیوں وہ ان کرسچین چھوکریوں کی طرف اتنا زیادہ راغب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے جسم کی تمام قابل نمائش چیزوں کی اچھی طرح نمائش کرتی ہیں۔ کسی قسم کی جھجک محسوس کیے بغیر اپنے ایام کی بے ترتیبی کا ذکر کر دیتی ہیں۔ اپنے پرانے معاشقوں کا حال سناتی ہیں۔۔۔ جب ڈانس کی دھن سنتی ہیں تو اپنی ٹانگیں تھرکانا شروع کر دیتی ہیں۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن کوئی بھی عورت ان تمام خوبیوں کی حامل ہو سکتی ہے۔
رندھیر نے جب گھاٹن لڑکی کو اشارے سے اوپر بلایا تو اسے کسی طرح بھی اس بات کا یقین نہیں تھا کہ وہ اسے اپنے ساتھ سلائے گا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد اس نے اس کے بھیگے

ہوئے کپڑے دیکھ کر یہ خیال کیا تھا کہیں ایسا نہ ہو کہ بیچاری کو نمونیا ہو جائے تو رندھیر نے اس سے کہا تھا، ''یہ کپڑے اتار دو۔'' سردی لگ جائے گی۔

وہ رندھیر کی اس بات کا مطلب سمجھ گئی تھی کیوں کہ اس کی آنکھوں میں شرم کے لال ڈورے تیر گئے تھے لیکن بعد میں جب رندھیر نے اسے اپنی دھوتی نکال کر دی تو اس نے کچھ دیر سوچ کر اپنا کاشٹا کھولا۔ جس پر میل بھیگنے کی وجہ سے اور بھی نمایاں ہو گیا تھا۔۔۔ کاشٹا کھول کر اس نے ایک طرف رکھ دیا اور جلدی سے دھوتی اپنی رانوں پر ڈال لی۔ پھر اس نے اپنی پھنسی پھنسی چولی اتارنے کی کوشش کی جس کے دونوں کناروں کو ملا کر اس نے ایک گانٹھ دے رکھی تھی۔ وہ گانٹھ اس کے تندرست سینے کے ننھے مگر میلے گڑھے میں جذب سی ہو گئی تھی۔
دیر تک وہ اپنے گھسے ہوئے ناخنوں کی مدد سے چولی کی گانٹھ کھولنے کی کوشش کرتی رہی جو بھیگنے کی وجہ سے بہت زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔ جب تھک ہار کر بیٹھ گئی تو اس نے مراٹھی زبان میں رندھیر سے کچھ کہا جس کا مطلب یہ تھا، ''میں کیا کروں۔۔۔ نہیں کھلتی۔''

رندھیر اس کے پاس بیٹھ گیا اور گرہ کھولنے لگا۔ تھک ہار کر اس نے ایک ہاتھ میں چولی کا ایک سرا پکڑا، دوسرے ہاتھ میں دوسرا۔ اور زور سے کھینچا، گرہ ایک دم پھسلی، رندھیر کے ہاتھ زور میں ادھر ادھر ہٹے، اور دو دھڑکتی ہوئی چھاتیاں نمودار ہوئیں۔
لمحہ بھر کے لیے رندھیر نے سوچا کہ اس کے اپنے ہاتھوں نے اس گھاٹن لڑکی کے سینے پر، نرم نرم گندھی ہوئی مٹی کو ماہر کمہار کی طرح دو پیالوں کی شکل بنا دی ہے۔

اس کی صحت مند چھاتیوں میں وہی گدراہٹ، وہی جاذبیت، وہی طراوت، وہی گرم گرم ٹھنڈک تھی جو کمہار کے ہاتھوں سے نکلے ہوئے تازہ تازہ کچے برتنوں میں ہوتی ہے۔
مٹمیلے رنگ کی ان جوان چھاتیوں میں جو بالکل بے داغ تھیں، ایک عجیب قسم کی چمک محلول تھی، سیاہی مائل گندمی رنگ کے نیچے دھندلی روشنی کی ایک تہہ سی تھی جس نے ایک عجیب وغریب قسم کی چمک پیدا کر دی تھی جو چمک ہوتے ہوئے بھی چمک نہیں تھی۔ اس کے سینے پر چھاتیوں کے یہ ابھار یہ ایسے دیے معلوم ہوتے تھے جو تالاب کے گدلے پانی پر جل رہے ہوں۔

برسات کے یہی دن تھے۔ کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے اسی طرح کپکپا رہے تھے۔ لڑکی کے دونوں کپڑے جو پانی میں شرابور ہو چکے تھے ایک غلیظ ڈھیری کی شکل میں فرش پر پڑے تھے اور وہ رندھیر کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ اس کے ننگے اور میلے بدن کی گرمی رندھیر کے جسم میں وہ کیفیت پیدا کر رہی تھی جو سخت سردیوں میں میں نائیوں کے غلیظ گرم حمام میں نہاتے وقت محسوس ہوا کرتی ہے۔
ساری رات وہ رندھیر کے ساتھ چمٹی رہی۔۔۔ دونوں جیسے ایک دوسرے کے مدغم ہو گیے تھے۔ انھوں نے بہ مشکل ایک دو باتیں کی ہوں گی۔ کیوں کہ جو کچھ انہیں کہنا تھا، سانسوں، ہونٹوں اور ہاتھوں سے طے ہو رہا تھا۔ رندھیر کے ہاتھ ساری رات اس کی چھاتیوں پر ہوائی لمس کی طرح پھرتے رہے۔ چھوٹی چھوٹی چوچیاں اور وہ موٹے موٹے مسام جو چاروں طرف ایک سیاہ دائرے کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے، اس ہوائی لمس سے جاگ اٹھتے اور اس گھاٹن لڑکی کے سارے جسم میں ایسا ارتعاش پیدا ہو جاتا کہ رندھیر خود بھی ایک لحظے کے لیے

کپکپا اٹھتا۔

ایسی کپکپاہٹوں سے رندھیر کا سیکڑوں بار واسطہ پڑ چکا تھا۔ وہ ان کو بخوبی جانتا تھا۔ کئی لڑکیوں کے نرم و نازک اور سخت سینوں سے اپنا سینہ ملا کر کئی کئی راتیں گزار چکا تھا۔ وہ ایسی لڑکیوں کے ساتھ بھی رہ چکا تھا جو بالکل اس کے ساتھ لپٹ کر گھر کی وہ ساری باتیں سنا دیا کرتی تھیں جو کسی غیر کے لیے نہیں ہوتیں۔ وہ ایسی لڑکیوں سے بھی جسمانی تعلق قائم کر چکا تھا جو ساری مشقت کرتی تھیں اور اسے کوئی تکلیف نہیں دیتی تھیں۔۔۔ لیکن یہ گھاٹن لڑکی جو پیڑ کے نیچے بھیگی ہوئی کھڑی تھی اور جسے اس نے اشارے سے اوپر بلا لیا تھا، مختلف تھی۔

ساری رات رندھیر کو اس کے جسم سے ایک عجیب قسم کی بو آتی رہی تھی۔ اس بو کو جو بیک وقت خوشبو بھی تھی اور بدبو بھی۔۔۔ وہ تمام رات پیتا رہا تھا۔ اس کی بغلوں سے، اس کی چھاتیوں سے، اس کے بالوں سے، اس کے پیٹ سے، ہر جگہ سے، یہ جو بدبو بھی تھی اور خوشبو بھی، رندھیر کے ہر سانس میں موجود تھی۔ تمام رات وہ سوچتا رہا تھا کہ یہ گھاٹن لڑکی بالکل قریب ہونے پر بھی ہرگز ہرگز اتنی زیادہ قریب نہ ہوتی اگر اس کے جسم سے یہ بو نہ اڑتی۔۔۔ یہ بو جو اس کے دل و دماغ کی ہر سلوٹ میں رینگ رہی تھی۔ اس کے تمام پرانے اور نئے خیالوں میں رچ گئی تھی۔

اس بو نے اس لڑکی کو اور اور رندھیر کو ایک رات کے لیے آپس میں حل کر دیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے اندر داخل ہو گیے تھے۔ عمیق ترین گہرائیوں میں اتر گیے تھے؛ جہاں پہنچ کر وہ ایک خالص انسانی لذت میں تبدیل ہو گیے تھے۔ ایسی لذت جو لمحاتی ہونے کے باوجود دائمی تھی، جو مائل پرواز ہونے کے باوجود ساکن اور جامد تھی۔۔۔ وہ دونوں ایک ایسا

پنچھی بن گیے تھے جو آسمان کی نیلاہٹوں میں اڑتا اڑتا غیر متحرک دکھائی دیتا ہے۔
اس بو کو جو اس گھاٹن لڑکی کے ہر مسام سے باہر نکلتی تھی، رندھیر اچھی طرح سمجھتا تھا، حالانکہ وہ اس کا تجزیہ نہیں کرسکتا تھا۔ جس طرح بعض اوقات مٹی پر پانی چھڑکنے سے سوندھی سوندھی باس پیدا ہوتی ہے۔۔۔ لیکن نہیں، وہ بو کچھ اور ہی قسم کی تھی۔ اس میں لونڈر اور عطر کا مصنوعی پن نہیں تھا، وہ بالکل اصلی تھی۔۔۔ عورت اور مرد کے باہمی تعلقات کی طرح اصلی اور ازلی۔

رندھیر کو پسینے کی بو سے سخت نفرت تھی۔ وہ نہانے کے بعد عام طور پر اپنی بغلوں وغیرہ میں خوشبودار پوڈر لگاتا تھا یا کوئی ایسی دوا استعمال کرتا تھا جس سے پسینے کی بو دب جائے۔ لیکن حیرت ہے کہ اس نے کئی بار۔۔۔ ہاں کئی بار اس گھاٹن لڑکی ی بالوں بھری بغلوں کو چوما اور اسے بالکل گھن نہ آئی بلکہ عجیب طرح کی لذت محسوس ہوئی۔ اس کی بغلوں کے نرنرم بال پسینے کے باعث گیلے ہو رہے تھے۔ ان سے وہی بو نکلتی تھی جو غایت درجہ قابل فہم ہونے کے باوجود ناقابل فہم تھی۔ رندھیر کو ایسا لگتا تھا کہ وہ اس بو کو جانتا ہے، پہچانتا ہے، اس کا مطلب بھی سمجھتا ہے لیکن کسی اور کو سمجھا نہیں سکتا۔
برسات کے یہی دن تھے۔۔۔ یہی، کھڑکی کے باہر جب اس نے دیکھا تو پیپل کے پتے لرز لرز کر نہا رہے تھے۔ ہوا میں سرسراہٹیں اور پھڑ پھڑاہٹیں گھلی ہوئی تھیں۔ اندھیرا تھا مگر اس میں دبی دبی، دھبدلی سی روشنی بھی سموئی ہوئی تھی جیسے بارش کے قطروں کے ساتھ لگ کر تاروں کی تھوڑی تھوڑی روشنی اتر آئی ہو۔۔۔ برسات کے یہی دن تھے جب رندھیر کے اس کمرے میں ساگوان کا صرف ایک پلنگ ہوتا تھا مگر اب اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا بھی پڑا تھا اور کونے میں ایک نئی ڈریسنگ ٹیبل بھی موجود تھی۔ دن یہی برسات کے تھے، موسم

بھی بالکل ایسا ہی تھا،مگر فضا میں عطر کی تیز خوشبو بسی ہوئی تھی۔

دوسرا پلنگ خالی تھا۔اس پلنگ پر جس پر رندھیر اوندھے منہ لیٹا کھڑکی کے باہر پیپل کے لرزتے ہوئے پتوں پر بارش کے قطروں کا رقص دیکھ رہا تھا،ایک گوری چٹی لڑکی اپنے ستر کو ننگے جسم سے چھپانے کی ناکام کوشش کرتے کرتے غالباً سو گئی تھی۔اس کی لال ریشمی شلوار دوسرے پلنگ پر پڑی تھی اس کے گہرے سرخ ازار بند کا ایک پھندنا نیچے لٹک رہا تھا۔ پلنگ پر اس کے دوسرے اترے ہوئے کپڑے بھی پڑے تھے۔اس کی سنہری پھولوں والی قمیص،انگیا،جانگیا اور دوپٹہ۔۔۔سب کا رنگ سرخ تھا۔۔۔بے حد سرخ۔یہ سب کپڑے حنا کے عطر کی تیز خوشبو میں بسے ہوئے تھے۔لڑکی کے سیاہ بالوں میں میشس کے ذرّے گرد کی طرح جمے ہوئے تھے۔ چہرے پر غازے،سرخی اور میشت کے ان ذرات نے مل جل کر ایک عجیب و غریب رنگ پیدا کر دیا تھا۔۔۔بے جان سا اڑا اڑا رنگ اور اس کے گورے سینے پر انگیا کے کچے رنگ نے جا بجا لال لال دھبے ڈال دیے تھے۔

چھاتیاں دودھ کی طرح سفید تھیں جس میں تھوڑی تھوڑی نیلاہٹ بھی تھی۔بغلوں کے بال منڈے ہوئے تھے جس کے باعث وہاں سرمئی غبار سا پیدا ہو گیا تھا۔رندھیر کئی بار اس لڑکی کی طرف دیکھ کر سوچ چکا تھا۔۔۔کیا ایسا نہیں لگتا جیسے میں نے ابھی ابھی کیلیں اکھیڑ کر اس کو لکڑی کے بند بکس میں سے نکالا ہے۔کتابوں اور چینی کے برتنوں کی طرح۔کونکہ جس طرح کتابوں پر داب کے نشان ہوتے ہیں،چینی کے برتنوں ہلنے جلنے سے خراشیں آجاتی ہیں، ٹھیک اسی طرح اس لڑکی کے بدن پر بھی کئی نشان تھے۔

جب رندھیر نے اس کی تنگ اور چست انگیا کی ڈوریاں کھولی تھیں تو اس کی پیٹھ پر اور سامنے سینے کے نرم نرم گوشت پر جھریاں سی بنی ہوئی تھیں اور کمر کے ارد گرد کس کر باندھے ہوئے

ازار بند کا نشان ۔۔۔وزنی اور نکیلے جڑاؤ نیکلس سے اس کے سینے پر کئی جگہ خراشیں پڑ گئی تھیں۔ جیسے ناخنوں سے بڑے زور سے کھجایا گیا ہو۔

برسات کے وہی دن تھے۔۔۔پیپل کے نرم کومل پتوں پر بارش کے قطرے گرنے سے ویسی ہی آواز پیدا ہو رہی تھی جیسی رندھیر اس دن ساری رات سنتا رہا تھا۔موسم بہت خوش گوار تھا۔ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی لیکن اس میں حنا کے عطر کی تیز خوشبو گھلی ہوئی تھی۔

رندھیر کے ہاتھ بہت دیر تک اس گوری چٹی لڑکی کے کچے دودھ ایسے سفید سینے پر ہوائی لمس کی طرح پھرتے رہے۔اس کی انگلیوں نے اس گورے گورے جسم میں کئی ارتعاش دوڑتے ہوئے محسوس کیے تھے۔اس کے نرم نرم جسم کے کئی گوشوں میں سمٹی ہوئی کپکپاہٹوں کا بھی پتہ چلا تھا جب اس نے اپنا سینہ اس کے سینے کے ساتھ ملایا تو رندھیر کے جسم کے ہر مسام نے اس لڑکی کے بدن کے چھڑے ہُوئے تاروں کی آواز سنی۔۔۔لیکن وہ پکار کہاں تھی؟ وہ پکار جو اس نے گھاٹن لڑکی کے جسم کی بو میں سونگھی تھی۔۔۔وہ پکار جو دودھ کے پیاسے بچے کے رونے سے کہیں زیادہ قابل فہم تھی، وہ پکار جو صوتی حدود سے نکل کر بے آواز ہو گئی تھی۔

رندھیر سلاخوں والی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔اس کے بہت قریب پیپل کے پتے لرز رہے تھے۔مگر وہ ان کی لرزشوں کے اس پار کہیں بہت دور دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا، جہاں اس مٹ میلے بادلوں میں عجیب قسم کی دھندلی روشنی دکھائی دیتی تھی۔۔۔ٹھیک ویسے ہی جیسی اس گھاٹن لڑکی کے سینے میں اسے نظر آئی تھی۔ایسی روشنی جو راز کی بات کی طرح چھپی ہوئی مگر ظاہر تھی۔

رندھیر کے پہلو میں ایک گوری چٹی لڑکی۔۔۔جس کا جسم دودھ اور گھی ملے آٹے کی طرح ملائم

تھا، لیٹی تھی ۔۔۔اس کے سوے ہوے جسم سے حنا کے عطر کی خوشبو آ رہی تھی ۔۔۔جواب تھکی تھکی معلوم ہوتی تھی ۔ رندھیر کو یہ دم توڑتی اور حالت نزع کو پہنچی ہوئی خوشبو بہت ناگوار معلوم ہوئی ۔اس میں کچھ کھٹاس تھی ۔۔۔ایک عجیب قسم کی کھٹاس جس طرح بدہضمی کے ڈکاروں میں ہوتی ہے ۔اداس ۔۔۔بے رنگ ۔۔۔بے کیف ۔

رندھیر نے اپنے پہلو میں لیٹی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھا ۔جس طرح پھٹے ہوئے دودھ میں سفید سفید بے جان پھٹکیاں بے رنگ پانی میں ساکن ہوتی ہیں، اسی طرح اس لڑکی کی نسوانیت اس کے وجود میں ٹھہری ہوئی تھی، سفید سفید دھبوں کی صورت میں ۔اصل میں رندھیر کے دل و دماغ میں وہ بو بسی ہوئی تھی جو اس گھاٹن لڑکی کے جسم سے بغیر کسی بیرونی کوشش کے باہر نکل رہی تھی ۔وہ بو جو حنا کے عطر سے کہیں زیادہ ہلکی پھلکی اور دور رس تھی ۔ جس میں سونگھے جانے کا اضطراب نہیں تھا ۔جو خود بخود ناک کے راستے داخل ہو کر اپنی صحیح منزل پر پہنچ گئی تھی ۔

رندھیر نے آخری کوشش کرتے ہوئے اس لڑکی کے دودھیالے جسم پر ہاتھ پھیرا مگر اسے کوئی کپکپاہٹ محسوس نہ ہوئی ۔۔۔اس کی نئی نویلی بیوی جو فرسٹ کلاس مجسٹریٹ کی لڑکی تھی، جس نے بی ۔اے تک تعلیم پائی تھی اور جو اپنے کالج میں سیکڑوں لڑکوں کے دل کی دھڑکن تھی ۔رندھیر کی نبض تیز نہ کرسکی ۔وہ حنا کی مرتی ہوئی خوشبو میں اس بو کی جستجو کرتا رہا جو برسات کے انھیں دنوں میں، جب کھڑکی کے باہر پیپل کے پتے بارش میں نہا رہے تھے، اسے گھاٹن لڑکی کے میلے جسم سے آئی تھی ۔

❁❁❁

دھواں

وہ جب اسکول کی طرف روانہ ہوا تو اس نے راستے میں ایک قصائی دیکھا، جس کے سر پر ایک بہت بڑا ٹوکرا تھا۔ اس ٹوکرے میں دو تازہ ذبح کیے ہوئے بکرے تھے۔ کھالیں اتری ہوئی تھیں، اور ان کے ننگے گوشت میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ جگہ جگہ پر یہ گوشت جس کو دیکھ کر مسعود کے ٹھنڈے گالوں پر گرمی کی لہریں سی دوڑ جاتی تھیں، پھڑک رہا تھا جیسے کبھی کبھی اس کی آنکھ پھڑکا کرتی تھی۔

اس وقت سوا نو بجے ہوں گے مگر جھکے ہوئے خاکستری بادلوں کے باعث ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت سویرا ہے۔ سردی میں شدت نہیں تھی، لیکن راہ چلتے آدمیوں کے منہ سے گرم گرم سماوار کی ٹونٹیوں کی طرح گاڑھا سفید دھواں نکل رہا تھا۔ ہر شے بوجھل دکھائی دیتی تھی جیسے بادلوں کے وزن کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ موسم کچھ ایسی ہی کیفیت کا حامل تھا جو ربڑ کے جوتے پہن کر چلنے سے پیدا ہوتی ہو۔ اس کے باوجود کہ بازار میں لوگوں کی آمدورفت جاری تھی اور دکانوں میں زندگی کے آثار پیدا ہو چکے تھے: آوازیں مدھم تھیں، جیسے سرگوشیاں ہو رہی ہیں، چپکے چپکے، دھیرے دھیرے باتیں ہو رہی ہیں، ہولے ہولے لوگ قدم اٹھا رہے ہیں کہ زیادہ اونچی آواز پیدا نہ ہو۔

مسعود بغل میں بستہ دبائے اسکول جا رہا تھا۔ آج اس کی چال بھی سست تھی۔ جب اس نے بے کھال کے تازہ ذبح کیے ہوئے بکروں کے گوشت سے سفید سفید دھواں اٹھتا دیکھا تو اسے راحت محسوس ہوئی۔ اس دھوئیں نے اس کے ٹھنڈے ٹھنڈے گالوں پر گرم گرم لکیروں کا ایک جال سا بن دیا۔ اس گرمی نے اسے راحت پہنچائی اور وہ سوچنے لگا کہ سردیوں میں ٹھنڈے یخ ہاتھوں پر بید کھانے کے بعد اگر یہ دھواں مل جایا کرے تو کتنا اچھا ہو۔

فضا میں اجلا پن نہیں تھا۔ روشنی تھی مگر دھندلی۔ کہر کی ایک پتلی سی تہہ ہر شے پر چڑھی ہوئی تھی جس سے فضا میں گدلا پن پیدا ہو گیا تھا۔ یہ گدلا پن آنکھوں کو اچھا معلوم ہوتا تھا اس لیے کہ نظر آنے والی چیزوں کی نوک پلک کچھ مدھم پڑ گئی تھی۔

مسعود جب اسکول پہنچا تو اسے اپنے ساتھیوں سے یہ معلوم کر کے قطعی طور پر خوشی نہ ہوئی کہ اسکول سکتر صاحب کی موت کے باعث بند کر دیا گیا ہے۔ سب لڑکے خوش تھے جس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ اپنے بستے ایک جگہ پر رکھ کر اسکول کے صحن میں اوٹ پٹانگ کھیلوں میں مشغول تھے۔ کچھ چھٹی کا پتہ معلوم کرتے ہی گھر چلے گیے۔ کچھ آ رہے تھے اور کچھ نوٹس بورڈ کے پاس جمع تھے اور بار بار ایک ہی عبارت پڑھ رہے تھے۔

مسعود نے جب سنا کہ سکتر صاحب مر گیے ہیں تو اسے بالکل افسوس نہ ہوا۔ اس کا دل جذبات سے بالکل خالی تھا۔ البتہ اس نے یہ ضرور سوچا کہ پچھلے برس جب اس کے دادا جان کا انتقال ان ہی دنوں میں ہوا تو ان کا جنازہ لے جانے میں بڑی دقت ہوئی تھی اس لیے کہ بارش شروع ہو گئی تھی۔ وہ بھی جنازے کے ساتھ گیا تھا اور قبرستان میں چکنی کیچڑ کے باعث ایسا پھسلا تھا کہ کھدی ہوئی قبر میں گرتے گرتے بچا تھا۔ یہ سب باتیں اس کو اچھی طرح یاد تھیں۔

سردی کی شدّت، اس کے کیچڑ سے لت پت کپڑے، سرخی مائل نیلے ہاتھ جن کو دبانے سے سفید سفید دھبے پڑ جاتے تھے، ناک جو کہ برف کی ڈلی معلوم ہوتی تھی اور پھر آ کر ہاتھ پاؤں دھونے اور کپڑے بدلنے کا مرحلہ۔۔۔ یہ سب کچھ اس کو اچھی طرح یاد تھا۔ چنانچہ جب اس نے سکتر صاحب کی موت کی خبر سنی تو اسے یہ بیتی ہوئی باتیں یاد آ گئیں اور اس نے سوچا، جب سکتر صاحب کا جنازہ اٹھے گا تو بارش شروع ہو جائے گی اور قبرستان میں اتنی کیچڑ ہو جائے گی کہ کئی لوگ پھسلیں گے اور ان کو ایسی چوٹیں آئیں گی کہ بلبلا اٹھیں گے۔

مسعود نے یہ خبر سن کر سیدھا اپنی کلاس کا رخ کیا۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے اپنے ڈسک کا تالا کھولا۔ دو تین کتابیں جو کہ اسے دوسرے روز پھر لانا تھیں، اس میں رکھیں اور باقی بستہ اٹھا کر گھر کی جانب چل پڑا۔

راستے میں اس نے پھر وہی دو تازہ ذبح کیے ہوئے بکرے دیکھے۔ ان میں سے ایک کو اب قصائی نے لٹکا دیا تھا دوسرا تختے پر پڑا تھا۔ جب مسعود دکان پر سے گزرا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ گوشت کو جس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا، چھو کر دیکھے۔ چنانچہ آگے بڑھ کر اس نے انگلی سے بکرے کے اس حصّے کو چھو کر دیکھا جو ابھی تک پھڑک رہا تھا۔ گوشت گرم تھا۔ مسعود کی ٹھنڈی انگلی کو یہ حرارت بہت بھلی معلوم ہوئی۔ قصائی دکان کے اندر چھریاں تیز کرنے میں مصروف تھا۔ چنانچہ مسعود نے ایک بار پھر گوشت کو چھو کر دیکھا اور وہاں سے چل پڑا۔

گھر پہنچ کر اس نے جب اپنی ماں کو سکتر صاحب کی موت کی خبر سنائی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے اباجی انہی کے جنازے کے ساتھ گئے ہیں۔ اب گھر میں صرف دو آدمی تھے۔ ماں اور

بڑی بہن۔ ماں باورچی خانہ میں بیٹھی سالن پکا رہی تھی اور بڑی بہن کلثوم پاس ہی ایک کانگڑی لیے درباری کی سرگم یاد کر رہی تھی۔

چونکہ گلی کے دوسرے لڑکے گورنمنٹ اسکول میں پڑھتے تھے۔جس پر اسلامیہ اسکول کے سکتر کی موت کا کچھ اثر نہیں پڑا تھا۔اس لیے مسعود نے خود کو بالکل بیکار محسوس کیا۔اسکول کا کوئی کام بھی نہیں تھا۔چھٹی جماعت میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ گھر میں اپنے اباجی سے پڑھ چکا تھا۔کھیلنے کے لیے بھی اس کے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ایک میلا کچیلا تاش طاق میں پڑا تھا مگر اس سے مسعود کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔لوڈو اور اسی قسم کے دوسرے کھیل جو اس کی بڑی بہن اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہر روز کھیلتی تھی اس کی سمجھ سے بالاتر تھے۔سمجھ سے بالاتر یوں تھے کہ مسعود نے کبھی ان کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔اس کو فطرتاً ایسے کھیلوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔

بستہ اپنی جگہ پر رکھنے اور کوٹ اتارنے کے بعد وہ باورچی خانے میں اپنی ماں کے پاس بیٹھ گیا اور درباری کی سرگم سنتا رہا جس میں کئی دفعہ سارے گاما آتا تھا۔اس کی ماں پالک کاٹ رہی تھی۔ پالک کاٹنے کے بعد اس نے سبز سبز پتوں کا گیلا گیلا ڈھیر اٹھا کر ہنڈیا میں ڈال دیا۔تھوڑی دیر کے بعد جب پالک کو آنچ لگی تو اس میں سے سفید سفید دھواں اٹھنے لگا۔ اس دھوئیں کو دیکھ کر مسعود کو بکرے کا گوشت یاد آ گیا۔ چنانچہ اس نے اپنی ماں سے کہا، ”امی جان، آج میں نے قصائی کی دکان پر دو بکرے دیکھے۔کھال اتری ہوئی تھی اور ان میں سے دھواں نکل رہا تھا بالکل ایسے ہی جیسا کہ صبح سویرے میرے منہ سے نکلا کرتا ہے۔“

”اچھا۔۔!“ یہ کہہ کر اس کی ماں چولھے میں لکڑیوں کے کوئلے جھاڑنے لگی۔”ہاں اور میں

نے گوشت کو اپنی انگلی سے چھو کر دیکھا تو وہ گرم تھا۔"

"اچھا۔۔۔!" یہ کہہ کر اس کی ماں نے وہ برتن اٹھایا جس میں اس نے پالک کا ساگ دھویا تھا اور باورچی خانہ سے باہر چلی گئی۔
"اور یہ گوشت کئی جگہ پر پھڑکتا بھی تھا۔"

"اچھا۔۔۔" مسعود کی بڑی بہن نے درباری سرگم یاد کرنا چھوڑ دی اور اس کی طرف متوجہ ہوئی۔" کیسے پھڑکتا تھا؟"
"یوں۔۔۔یوں۔" مسعود نے انگلیوں سے پھڑکن پیدا کر کے اپنی بہن کو دکھائی۔

"تو پھر کیا ہوا؟"
یہ سوال کلثوم نے اپنے سرگم بھرے دماغ سے کچھ اس طور پر نکالا کہ مسعود ایک لحظے کے لیے بالکل خالی الذہن ہو گیا۔" پھر کیا ہونا تھا، میں نے تو ایسے ہی آپ سے بات کی تھی کہ قصائی کی دکان پر گوشت پھڑک رہا تھا۔ میں نے انگلی سے چھو کر بھی دیکھا تھا۔ گرم تھا۔"

"گرم تھا۔۔۔اچھا مسعود یہ بتاؤ تم میرا ایک کام کرو گے۔"
"بتائیے۔"

"آؤ، میرے ساتھ آؤ۔"
"نہیں آپ پہلے بتائیے۔ کام کیا ہے۔"

"تم آؤ تو سہی میرے ساتھ۔"

''جی نہیں ۔۔۔آپ پہلے کام بتائیے۔''

''دیکھو میری کمر میں بڑا درد ہو رہا ہے ۔۔۔میں پلنگ پر لیٹتی ہوں، تم ذرا پاؤں سے دبا دینا۔۔۔اچھے بھائی جو ہوئے۔اللہ کی قسم بڑا درد ہو رہا ہے۔'' یہ کہہ کر مسعود کی بہن نے اپنی کمر پر مکیاں مارنا شروع کر دیں۔

''یہ آپ کی کمر کو کیا ہو جاتا ہے۔جب دیکھو درد ہو رہا ہے، اور پھر آپ دبواتی بھی مجھی سے ہیں، کیوں نہیں اپنی سہیلیوں سے کہتیں۔''مسعود اٹھ کھڑا ہوا۔

''چلیے ،لیکن یہ آپ سے کہے دیتا ہوں کہ دس منٹ سے زیادہ میں بالکل نہیں دباؤں گا۔''

''شاباش ۔۔۔شاباش۔''اس کی بہن اٹھ کھڑی ہوئی اور سرگموں کی کاپی سامنے طاق میں رکھ کر اس کمرے کی طرف روانہ ہوئی جہاں وہ اور مسعود دونوں سوتے تھے۔صحن میں پہنچ کر اس نے اپنی دکھتی ہوئی کمر سیدھی کی اور اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔مٹیالے بادل جھکے ہوئے تھے۔''مسعود، آج ضرور بارش ہوگی۔'' یہ کہہ کر اس نے مسعود کی طرف دیکھا مگر وہ اندر اپنی چارپائی پر لیٹا تھا۔

جب کلثوم اپنے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ گئی تو مسعود نے اٹھ کر گھڑی میں وقت دیکھا۔'' دیکھئے باجی گیارہ بجنے میں دس منٹ باقی ہیں۔میں پورے گیارہ بجے آپ کی کمر دابنا چھوڑ دوں گا۔''

''بہت اچھا،لیکن تم اب خدا کے لیے زیادہ نخرے نہ بگھارو۔ادھر میرے پلنگ پر آ کر جلدی کمر دباؤ ورنہ یاد رکھو بڑے زور سے کان اینٹھوں گی۔'' کلثوم نے مسعود کو ڈانٹ پلائی۔مسعود

نے اپنی بڑی بہن کے حکم کی تعمیل کی اور دیوار کا سہارا لے کر پاؤں سے اس کی کمر دبانا شروع کر دی۔ مسعود کے وزن کے نیچے کلثوم کی چوڑی چکلی کمر میں خفیف سا جھکاؤ پیدا ہوگیا۔ جب اس نے پیروں سے دبانا شروع کیا، ٹھیک اسی طرح جس طرح مزدور مٹی گوندھتے ہیں تو کلثوم نے مزا لینے کی خاطر ہولے ہولے ہائے ہائے کرنا شروع کیا۔

کلثوم کے کولھوں پر گوشت زیادہ تھا، جب مسعود کا پاؤں اس حصے پر پڑا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس بکرے کے گوشت کو دبا رہا ہے جو اس نے قصائی کی دکان میں اپنی انگلی سے چھو کر دیکھا تھا۔ اس احساس نے چند لمحات کے لیے اس کے دل و دماغ میں ایسے خیالات پیدا کیے جن کا کوئی سر تھا نہ پیر، وہ ان کا مطلب نہ سمجھ سکا اور سمجھتا بھی کیسے جبکہ کوئی خیال مکمل نہیں تھا۔

ایک دو بار مسعود نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے پیروں کے نیچے گوشت کے لوتھڑوں میں حرکت پیدا ہوئی ہے، اسی قسم کی حرکت جو اس نے بکرے کے گرم گرم گوشت میں دیکھی تھی۔ اس نے بڑی بددلی سے کمر دبانا شروع کی تھی مگر اب اسے اس کام میں لذت محسوس ہونے لگی۔ اس کے وزن کے نیچے کلثوم ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ یہ بھنچی بھنچی آواز جو کہ مسعود کے پیروں کی حرکت کا ساتھ دے رہی تھی اس گمنام سی لذت میں اضافہ کر رہی تھی۔

ٹائم پیس میں گیارہ بج گیے مگر مسعود اپنی بہن کلثوم کی کمر دباتا رہا۔ جب کمر اچھی طرح دبائی جا چکی تو کلثوم سیدھی لیٹ گئی اور کہنے لگی۔ ”شاباش مسعود، شاباش۔ لو اب لگے ہاتھوں ٹانگیں بھی دبا دو، بالکل اسی طرح۔۔۔شاباش میرے بھائی۔“

مسعود نے دیوار کا سہارا لے کر کلثوم کی رانوں پر جب اپنا پورا وزن ڈالا تو اس کے پاؤں

کے نیچے مچھلیاں سی تڑپ گئیں۔ بے اختیار وہ ہنس پڑی اور دہری ہوگئی۔ مسعود گرتے گرتے بچا، لیکن اس کے تلووں میں مچھلیوں کی وہ تڑپ منجمد سی ہوگئی۔ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ پھر اسی طرح دیوار کا سہارا لے کر اپنی بہن کی رانیں دبائے، چنانچہ اس نے کہا،"یہ آپ نے ہنسنا کیوں شروع کر دیا۔ سیدھی لیٹ جائیے۔ میں آپ کی ٹانگیں دبادوں۔"

کلثوم سیدھی لیٹ گئی۔ رانوں کی مچھلیاں ادھر ادھر ہونے کے باعث جو گدگدی پیدا ہوئی تھی اس کا اثر ابھی تک اس کے جسم میں باقی تھا۔"نا بھائی میرے گدگدی ہوتی ہے۔ تم اوٹ پٹانگ طریقے سے دباتے ہو۔"

مسعود نے خیال کیا کہ شاید اس نے غلط طریقہ استعمال کیا ہے۔ نہیں، اب کی دفعہ میں پورا بوجھ آپ پر نہیں ڈالوں گا۔۔ آپ اطمینان رکھیے۔ اب ایسی اچھی طرح دباؤں گا کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔"

دیوار کا سہارا لے کر مسعود نے اپنے جسم کو تولا اور اس انداز سے آہستہ آہستہ کلثوم کی رانوں پر اپنے پیر جمائے کہ اس کا آدھا بوجھ کہیں غائب ہوگیا۔ ہولے ہولے بڑی ہوشیاری سے اس نے اپنے پیر چلانے شروع کیے۔ کلثوم کی رانوں میں اکڑی ہوئی مچھلیاں اس کے پیروں کے نیچے دب دب کر ادھر ادھر پھسلنے لگیں۔ مسعود نے ایک بار اسکول میں تنے ہوئے رسے پر ایک بازیگر کو چلتے دیکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ بازیگر کے پیروں کے نیچے تنا ہوا رسا اسی طرح پھسلتا ہوگا۔

اس سے پہلے کئی بار اس نے اپنی بہن کلثوم کی ٹانگیں دبائی تھیں مگر وہ لذت جو کہ اسے اب محسوس ہو رہی تھی پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بکرے کے گرم گرم گوشت کا اسے بار بار خیال

آتا تھا۔ایک دو مرتبہ اس نے سوچا،''کلثوم کو اگر ذبح کر دیا جائے تو کھال اتر جانے پر کیا اس کے گوشت میں سے بھی دھواں نکلے گا؟''لیکن ایسی بیہودہ باتیں سوچنے پر اس نے اپنے آپ کو مجرم محسوس کیا اور دماغ کو اس طرح صاف کر دیا جیسے وہ سلیٹ کو اسفنج سے صاف کیا کرتا تھا۔

''بس بس۔''کلثوم تھک گئی۔''بس بس۔''

مسعود کو ایک دم شرارت سوجھی۔وہ پلنگ پر سے نیچے اترنے لگا تو اس نے کلثوم کی دونوں بغلوں میں گدگدی کرنا شروع کر دی۔ہنسی کے مارے وہ لوٹ پوٹ ہوگئی۔اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ مسعود کے ہاتھوں کو پرے جھٹک دے۔لیکن جب اس نے ارادہ کرکے اس کے لات جمانی چاہی تو مسعود اچھل کر زد سے باہر ہوگیا اور سلیپر پہن کر کمرے سے نکل گیا۔

جب وہ صحن میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہے۔بادل اور بھی جھک آئے تھے۔پانی کے ننھے ننھے قطرے آواز پیدا کیے بغیر صحن کی اینٹوں میں آہستہ آہستہ جذب ہو رہے تھے۔مسعود کا جسم ایک دل نواز حرارت محسوس کر رہا تھا۔جب ہوا کا ٹھنڈا ٹھنڈا جھونکا اس کے گالوں کے ساتھ مس ہوا اور دو تین ننھی ننھی بوندیں اس کی ناک پر پڑیں تو ایک جھرجھری سی اس کے بدن میں لہرا اٹھی۔سامنے کوٹھے کی دیوار پر ایک کبوتر اور کبوتری پاس پاس پَر پھلائے بیٹھے تھے،ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں دم پخت کی ہوئی ہنڈیا کی طرح گرم ہیں۔گل داؤدی اور ناز بو کے ہرے ہرے پتے اوپر لال لال گملوں میں نہا رہے تھے۔فضا میں نیندیں گھلی ہوئی تھیں۔ایسی نیندیں جن میں بیداری زیادہ ہوتی ہے اور

انسان کے ارد گرد نرم نرم خواب یوں لپٹ جاتے ہیں جیسے اونی کپڑے۔
مسعود ایسی باتیں سوچنے لگا۔ جن کا مطلب اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ ان باتوں کو چھو کر دیکھ سکتا تھا مگر ان کا مطلب اس کی گرفت سے باہر تھا، پھر بھی ایک گمنام سا مزا اس سوچ بچار میں اسے آرہا تھا۔
بارش میں کچھ دیر کھڑے رہنے کے باعث جب مسعود کے ہاتھ بالکل یخ ہوگیے اور دبانے سے ان پر سفید دھبے پڑنے لگے تو اس نے مٹھیاں کس لیں اور ان کو منہ کی بھاپ سے گرم کرنا شروع کیا۔ ہاتھوں کو اس عمل سے کچھ گرمی تو پہنچی مگر وہ نم آلود ہوگیے۔ چنانچہ آگ تاپنے کے لیے وہ باورچی خانہ میں چلا گیا۔ کھانا تیار تھا، ابھی اس نے پہلا لقمہ ہی اٹھایا تھا کہ اس کا باپ قبرستان سے واپس آگیا۔
باپ بیٹے میں کوئی بات نہ ہوئی۔ مسعود کی ماں اٹھ کر فوراً دوسرے کمرے میں چلی گئی اور وہاں دیر تک اپنے خاوند کے ساتھ باتیں کرتی رہی۔

کھانے سے فارغ ہو کر مسعود بیٹھک میں چلا گیا اور کھڑکی کھول کر فرش پر لیٹ گیا۔ بارش کی وجہ سے سردی کی شدت بڑھ گئی تھی کیونکہ اب ہوا بھی چل رہی تھی، مگر یہ سردی ناخوشگوار معلوم نہیں ہوتی تھی۔ تالاب کے پانی کی طرح یہ اوپر ٹھنڈی اور اندر گرم تھی۔
مسعود جب فرش پر لیٹا تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس سردی کے اندر دھنس جائے جہاں اس کے جسم کو راحت انگیز گرمی پہنچے۔ دیر تک وہ ایسی شیر گرم باتوں کے متعلق سوچتا رہا جس کے باعث اس کے پٹھوں میں ہلکی ہلکی سی دکھن پیدا ہوگئی۔ ایک دو بار اس نے انگڑائی لی تو اسے مزا آیا۔ اس کے جسم کے کسی حصّے میں، یہ اس کو معلوم نہیں تھا کہ کہاں،

کوئی چیز اٹک سی گئی تھی، یہ چیز کیا تھی۔ اس کے متعلق بھی مسعود کو علم نہیں تھا۔ البتہ اس اٹکاؤ نے اس کے سارے جسم میں اضطراب، ایک دبے ہوئے اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس کا سارا جسم کھنچ کر لمبا ہو جانے کا ارادہ بن گیا تھا۔

دیر تک گدگدے قالین پر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ اٹھا اور باورچی خانہ سے ہوتا ہوا صحن میں آنکلا۔ نہ کوئی باورچی خانہ میں تھا اور نہ صحن میں۔ ادھر ادھر جتنے کمرے تھے سب کے سب بند تھے۔ بارش اب رک گئی تھی۔ مسعود نے ہاکی اور گیند نکالی اور صحن میں کھیلنا شروع کر دیا۔ ایک بار جب اس نے زور سے ہٹ لگائی تو گیند صحن کے دائیں ہاتھ والے کمرے کے دروازے پر لگی۔ اندر سے مسعود کے باپ کی آواز آئی ''کون؟''

''جی میں ہوں مسعود!''

اندر سے آواز آئی ''کیا کر رہے ہو؟''

''جی کھیل رہا ہوں۔''

''کھیلو۔۔۔'' پھر تھوڑے سے توقف کے بعد اس کے باپ نے کہا ''تمہاری ماں میرا سر دبا رہی ہے۔۔۔ زیادہ شور نہ مچانا۔''

یہ سن کر مسعود نے گیند وہیں پڑی رہنے دی اور ہاکی ہاتھ میں لیے سامنے والے کمرے کا رخ کیا۔ اس کا ایک دروازہ بند تھا اور دوسرا نیم وا۔۔۔ مسعود کو ایک شرارت سوجھی۔ دبے پاؤں وہ نیم وا دروازے کی طرف بڑھا اور دھماکے کے ساتھ دونوں پٹ کھول دیے۔ دو چیخیں بلند ہوئیں اور کلثوم اور اس کی سہیلی بملا نے جو کہ پاس پاس لیٹی تھی، خوف زدہ ہو کر جھٹ سے

لحاف اوڑھ لیا۔

بملا کے بلاؤز کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور کلثوم اس کے عریاں سینے کو گھور رہی تھی۔
مسعود کچھ سمجھ نہ سکا، اس کے دماغ میں دھواں سا چھا گیا۔ وہاں سے الٹے قدم لوٹ کر وہ جب بیٹھک کی طرف روانہ ہوا تو اسے معاً اپنے اندر ایک اتھاہ طاقت کا احساس ہوا۔ جس نے کچھ دیر کے لیے اس کی سوچنے سمجھنے کی قوت بالکل کمزور کر دی۔ بیٹھک میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر جب مسعود نے ہاکی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گھٹنے پر رکھا تو یہ سوچا کہ ہلکا سا دباؤ ڈالنے پر ہاکی میں خم پیدا ہو جائے گا، اور زیادہ زور لگانے پر ہینڈل چٹاخ سے ٹوٹ جائے گا۔ اس نے گھٹنے پر ہاکی کے ہینڈل میں خم تو پیدا کر لیا مگر زیادہ سے زیادہ زور لگانے پر بھی وہ ٹوٹ نہ سکا۔ دیر تک وہ ہاکی کے ساتھ کشتی لڑتا رہا۔ جب وہ تھک کر ہار گیا تو جھنجھلا کر اس نے ہاکی پرے پھینک دی۔

شاردا

نذیر بلیک مارکیٹ سے وسکی کی بوتل لانے گیا۔ بڑک ڈاک خانے سے کچھ آگے بندرگاہ کے پھاٹک سے کچھ ادھر سگرٹ والے کی دکان سے اس کو اسکاچ مناسب داموں پر مل جاتی تھی۔ جب اس نے پینتیس روپے ادا کر کے کاغذ میں لپٹی ہوئی بوتل لی تو اس وقت گیارہ بجے تھے دن کے۔ یوں تو وہ رات کو پینے کا عادی تھا مگر اس روز موسم خوشگوار ہونے کے باعث وہ چاہتا تھا کہ صبح ہی سے شروع کر دے اور رات تک پیتا رہے۔

بوتل ہاتھ میں پکڑے وہ خوش خوش گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اس کا ارادہ تھا کہ بوری بندر کے اسٹینڈ سے ٹیکسی لے گا۔ ایک پیگ اس میں بیٹھ کر پیے گا اور ہلکے ہلکے سرور میں گھر پہنچ جائے گا۔ بیوی منع کرے گی تو وہ اس سے کہے گا ''موسم دیکھ کتنا اچھا ہے۔'' پھر وہ اسے وہ بھونڈا سا شعر سنائے گا،

کی فرشتوں کی راہ ابر نے بند
جو گناہ کیجیے ثواب ہے آج

وہ کچھ دیر ضرور چخ چخ کرے گی، لیکن بالآخر خاموش ہو جائے گی اور اس کے کہنے پر قیمے کے پراٹھے بنانا شروع کر دے گی۔

دکان سے بیس پچیس گز دور گیا ہو گا کہ ایک آدمی نے اس کو سلام کیا۔ نذیر کا حافظہ کمزور تھا۔ اس نے سلام کرنے والی آدمی کو نہ پہچانا، لیکن اس پر یہ ظاہر نہ کیا کہ وہ اس کو نہیں جانتا، چنانچہ

بڑے اخلاق سے کہا،''کیوں بھئی کہاں ہوتے ہو۔کبھی نظر ہی نہیں آئے۔''
اس آدمی نے مسکرا کر کہا،''حضور، میں تو یہیں ہوتا ہوں۔آپ ہی کبھی تشریف نہیں لائے۔''
نذیر نے اس کو پھر بھی نہ پہچانا،''میں اب جو تشریف لے آیا ہوں۔''

''تو چلیے میرے ساتھ۔''
نذیر اس وقت بڑے اچھے موڈ میں تھا،''چلو۔''اس آدمی نے نذیر کے ہاتھ میں بوتل دیکھی اور معنی خیز طریقے پر مسکرایا،''باقی سامان تو آپ کے پاس موجود ہے۔''یہ فقرہ سن کر نذیر نے فوراً ہی سوچا کہ وہ دلال ہے،''تمہارا نام کیا ہے؟''

''کریم۔۔۔آپ بھول گئے تھے!''
نذیر کو یاد آگیا کہ شادی سے پہلے ایک کریم اس کے لیے اچھی اچھی لڑکیاں لایا کرتا تھا۔بڑا ایمان دار دلال تھا۔اس کو غور سے دیکھا تو صورت جانی پہچانی معلوم ہوئی۔پھر پچھلے تمام واقعات اس کے ذہن میں ابھر آئے۔کریم سے اس نے معذرت چاہی،''یار میں نے تمہیں پہچانا نہیں تھا۔میرا خیال ہے۔غالباً چھ برس ہو گئے ہیں تم سے ملے ہوئے۔''

''جی ہاں۔''
''تمہارا اڈہ تو پہلے گرانٹ روڈ کانا کا ہوا کرتا تھا؟''

کریم نے بیڑی سلگائی اور ذرا فخر سے کہا،''میں نے وہ چھوڑ دیا ہے۔آپ کی دعا سے اب یہاں ایک ہوٹل میں دھندا شروع کر رکھا ہے۔''نذیر نے اس کو داد دی،''یہ بہت اچھا کیا تم نے؟''کریم نے اور زیادہ فخریہ لہجے میں کہا،''دس چھوکریاں ہیں۔۔۔ایک بالکل نئی ہے۔''

نذیر نے اس کو چھیڑنے کے انداز میں کہا،''تم لوگ یہی کہا کرتے ہو۔''
کریم کو برا لگا،''قسم قرآن کی، میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔سور کھاؤں اگر وہ چھوکری بالکل نئی نہ ہو۔'' پھر اس نے اپنی آواز دھیمی کی اور نذیر کے کان کے ساتھ منہ لگا کر کہا،'' آٹھ دن ہوئے ہیں جب پہلا پیسنجر آیا تھا۔جھوٹ بولوں تو میرا منہ کالا ہو۔''

نذیر نے پوچھا،''کنواری تھی؟''
''جی ہاں۔۔۔دو سو روپے لیے تھے اس پیسنجر سے۔''

نذیر نے کریم کی پسلیوں میں ایک ٹھونکا دیا،''لو، یہیں بھاؤ پکا کرنے لگے۔''
کریم کو نذیر کی یہ بات پھر بری لگی،''قسم قرآن کی، سور ہو جو آپ سے بھاؤ کرے آپ تشریف لے چلیے۔آپ جو بھی دیں گے مجھے قبول ہوگا۔کریم نے آپ کا بہت نمک کھایا ہے۔''نذیر کی جیب میں اس وقت ساڑھے چار سو روپے تھے۔موسم اچھا تھا۔موڈ بھی اچھا تھا۔وہ چھ برس پیچھے کے زمانے میں چلا گیا۔بن بیئے مسرور تھا،''چلو یار آج تمام عیاشیاں رہیں۔۔۔ایک بوتل کا اور بندوبست ہو جانا چاہیے۔''

کریم نے پوچھا،'' آپ کتنے میں لائے ہیں یہ بوتل؟''
''پینتیس روپے میں۔''

''کون سا برانڈ ہے؟''
''جونی واکر!''

کریم نے چھاتی پر ہاتھ مار کر کہا،''میں آپ کو تیس میں لا دوں گا۔''
نذیر نے دس دس کے تین نوٹ نکالے اور کریم کے ہاتھ میں دے دیے،''نیکی اور پوچھ پوچھ۔۔۔ یہ لو۔ مجھے وہاں بٹھا کر تم پہلا کام یہی کرنا۔ تم جانتے ہو، میں ایسے معاملوں میں اکیلا نہیں پیا کرتا۔'' کریم مسکرایا،''اور آپ کو یاد ہوگا۔ میں ڈیڑھ پیگ سے زیادہ نہیں پیا کرتا۔'' نذیر کو یاد آگیا کہ کریم واقعی آج سے چھ برس پہلے صرف ڈیڑھ پیگ لیا کرتا تھا۔ یہ یاد کر کے نذیر بھی مسکرایا،''آج دو رہیں۔''

''جی نہیں۔ ڈیڑھ سے زیادہ ایک قطرہ بھی نہیں۔''
کریم ایک تھرڈ کلاس بلڈنگ کے پاس ٹھہر گیا، جس کے ایک کونے میں چھوٹے سے میلے بورڈ پر''میرینا ہوٹل'' لکھا تھا۔ نام تو خوبصورت تھا مگر عمارت نہایت ہی غلیظ تھی، سیڑھیاں شکستہ۔ نیچے سودخور پٹھان بڑی بڑی شلواریں پہنے کھاٹوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ پہلی منزل پر کرسچین آباد تھے۔ دوسری منزل پر جہاز کے بے شمار خلاصی۔ تیسری منزل ہوٹل کے مالک کے پاس تھی۔ چوتھی منزل پر کونے کا ایک کمرہ کریم کے پاس تھا جس میں کئی لڑکیاں مرغیوں کی طرح اپنے ڈربے میں بیٹھی تھیں۔

کریم نے ہوٹل کے مالک سے چابی منگوائی۔ ایک بڑا لیکن بے ہنگم سا کمرہ کھولا جس میں لوہے کی ایک چارپائی، ایک کرسی اور ایک تپائی پڑی تھی۔ تین اطراف سے یہ کمرہ کھلا تھا، یعنی بے شمار کھڑکیاں تھیں، جن کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے اور کچھ نہیں، لیکن ہوا کی بہت افراط تھی۔
کریم نے آرام کرسی جو کہ بے حد میلی تھی، ایک اس سے زیادہ میلے کپڑے سے صاف کی اور

نذیر سے کہا،’’تشریف رکھئے، لیکن میں یہ عرض کردوں، اس کمرے کا کرایہ دس روپے ہوگا۔‘‘ نذیر نے کمرے کو اب ذرا غور سے دیکھا،’’دس روپے زیادہ ہیں یار؟‘‘ کریم نے کہا،’’بہت زیادہ ہیں، لیکن کیا کیا جائے۔سالا ہوٹل کا مالک ہی بنیا ہے۔ایک پیسہ کم نہیں کرتا۔اور نذیر صاحب موج شوق کرنے والے آدمی بھی زیادہ کی پروانہیں کرتے۔‘‘ نذیر نے کچھ سوچ کر کہا،’’تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔کرایہ پیشگی دے دوں؟‘‘

’’جی نہیں۔۔۔آپ پہلے چھوکری تو دیکھئے۔‘‘ یہ کہہ کر وہ اپنے ڈربے میں چلا گیا۔تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک نہایت ہی شرمیلی لڑکی تھی۔گھریلو قسم کی ہندو لڑکی سفید دھوتی باندھے تھی۔عمر چودہ برس کے لگ بھگ ہوگی۔خوش شکل تو نہیں تھی لیکن بھولی بھالی تھی۔کریم نے اس سے کہا،’’بیٹھ جاؤ۔ یہ صاحب میرے دوست ہیں۔ بالکل اپنے آدمی ہیں۔‘‘لڑکی نظریں نیچے کیے لوہے کی چارپائی پر بیٹھ گئی۔کریم یہ کہہ کر چلا گیا،’’اپنا اطمینان کر لیجئے نذیر صاحب۔۔۔میں گلاس اور سوڈا لاتا ہوں۔‘‘نذیر آرام کرسی پر سے اٹھ کر لڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔وہ سمٹ کر ایک طرف ہٹ گئی۔نذیر نے اس سے چھ برس پہلے کے انداز میں پوچھا، ’’آپ کا نام؟‘‘لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔نذیر نے آگے سرک کر اس کے ہاتھ پکڑے اور پھر پوچھا،’’آپ کا نام کیا ہے جناب؟‘‘

لڑکی نے ہاتھ چھڑا کر کہا،’’شکنتلا۔‘‘اور نذیر کو شکنتلا یاد آ گئی، جس پر راجہ دشنیت عاشق ہوا تھا، ’’میرا نام دشنیت ہے۔‘‘ نذیر مکمل عیاشی پر تلا ہوا تھا۔لڑکی نے اس کی بات سنی اور مسکرا دی۔اتنے میں کریم آ گیا۔اس نے نذیر کو سوڈے کی چار بوتلیں دکھائیں جو ٹھنڈی ہونے کے باعث پسینہ چھوڑ رہی تھیں،’’مجھے یاد ہے کہ آپ کو روجر کا سوڈا پسند ہے، برف میں لگا ہوا

لے کر آیا ہوں۔''

نذیر بہت خوش ہوا،''تم کمال کرتے ہو۔'' پھر وہ لڑکی سے مخاطب ہوا،''جناب آپ بھی شوق فرمائیں گی؟''لڑکی نے کچھ نہ کہا۔کریم نے جواب دیا،''نذیر صاحب۔ یہ نہیں پیتی۔آٹھ دن تو ہوئے ہیں اس کو یہاں آئے ہوئے۔''یہ سن کر نذیر کو افسوس سا ہوا،''یہ تو بہت بری بات ہے۔'' کریم نے وسکی کی بوتل کھول کر نذیر کے لیے ایک بڑا پیگ بنایا اور اس کو آنکھ مار کر کہا، ''آپ راضی کر لیجیے اسے۔'' نذیر نے ایک ہی جرعے میں گلاس ختم کیا۔کریم نے آدھا پیگ پیا۔فوراً ہی اس کی آواز نشہ آلود ہو گئی۔ذرا جھوم کر اس نے نذیر سے پوچھا،''چھوکری پسند ہے نا آپ کو؟'' نذیر نے سوچا کہ لڑکی اسے پسند ہے کہ نہیں۔لیکن وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

اس نے شکنتلا کی طرف غور سے دیکھا۔اگر اس کا نام شکنتلا نہ ہوتا تو بہت ممکن ہے وہ اسے پسند کر لیتا۔وہ شکنتلا جس پر راجہ دشنیت شکار کھیلتے کھیلتے عاشق ہوا تھا،بہت ہی خوبصورت تھی۔کم از کم کتابوں میں یہی درج تھا کہ وہ چندے آفتاب چندے ماہتاب تھی۔آہو چشم تھی۔نذیر نے ایک بار پھر اپنی شکنتلا کی طرف دیکھا۔

اس کی آنکھیں بری نہیں تھیں۔آہو چشم تو نہیں تھی،لیکن اس کی آنکھیں اس کی اپنی آنکھیں تھیں۔کالی کالی اور بڑی بڑی۔اس نے اور کچھ سوچا اور کریم سے کہا،''ٹھیک ہے یار۔۔۔بولو معاملہ کہاں طے ہوتا ہے؟'' کریم نے آدھا پیگ اپنے لیے اور انڈیلا اور کہا،''سو روپے!'' نذیر نے سوچنا بند کر دیا تھا،''ٹھیک ہے!''

کریم اپنا دوسرا آدھا پیگ پی کر چلا گیا۔نذیر نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔شکنتلا کے پاس بیٹھا تو وہ گھبرا سی گئی۔نذیر نے اس کا پیار لینا چاہا تو وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔نذیر کو اس کی یہ حرکت ناگوار

محسوس ہوئی لیکن اس نے پھر کوشش کی۔ بازو سے پکڑ کر اس کو اپنے پاس بٹھایا۔ زبردستی اس کو چوما۔ بہت ہی بے کیف سلسلہ تھا۔ البتہ وسکی کا نشہ اچھا تھا۔ وہ اب تک چھ پیگ پی چکا تھا اور اس کو افسوس تھا کہ اتنی مہنگی چیز بالکل بے کار گئی ہے، اس لیے کہ شکنتلا بالکل الھڑ تھی۔ اس کو ایسے معاملوں کے آداب کی کوئی واقفیت ہی نہیں تھی۔ نذیر ایک اناڑی تیراک کے ساتھ ادھر ادھر بے کار ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ آخر اکتا گیا۔ دروازہ کھول کر اس نے کریم کو آواز دی جو اپنے ڈربے میں مرغیوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آواز سن کر دوڑا آیا۔ ''کیا بات ہے نذیر صاحب؟''

نذیر نے بڑی ناامیدی سے کہا، ''کچھ نہیں یار۔ یہ اپنے کام کی نہیں ہے؟''

''کیوں؟''

''کچھ سمجھتی ہی نہیں۔''

کریم نے شکنتلا کو الگ لے جا کر بہت سمجھایا مگر وہ نہ سمجھ سکی۔ شرمائی، لجائی، دھوتی سنبھالتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ کریم نے اس پر کہا،''میں ابھی حاضر کرتا ہوں۔''

نذیر نے اس کو روکا،'' جانے دو۔۔۔ کوئی اور لے آؤ۔ لیکن اس نے فوراً ہی ارادہ بدل لیا،'' وہ جو تمہیں روپے دیے تھے، اس کی بوتل لے آؤ اور شکنتلا کے سوا جتنی لڑکیاں اس وقت موجود ہیں انھیں یہاں بھیج دو۔۔۔ میرا مطلب ہے جو پیتی ہیں۔ آج اور کوئی سلسلہ نہیں ہوگا۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کروں گا اور بس!''

کریم نذیر کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس نے چار لڑکیاں کمرے میں بھیج دیں۔ نذیر نے ان سب

کو سرسری نظر سے دیکھا، کیونکہ وہ اپنے دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ پروگرام صرف پینے کا ہوگا۔ چنانچہ اس نے ان لڑکیوں کے لیے گلاس منگوائے اور ان کے ساتھ پینا شروع کر دیا۔ دوپہر کا کھانا ہوٹل سے منگوا کر کھایا اور شام کے چھ بجے تک ان لڑکیوں سے باتیں کرتا رہا۔ بڑی فضول قسم کی باتیں، لیکن نذیر خوش تھا۔ جو کوفت شکنتلا نے پیدا کی تھی، دور ہوگئی تھی۔

آدھی بوتل باقی تھی، وہ ساتھ لے کر گھر چلا گیا۔ پندرہ روز کے بعد پھر موسم کی وجہ سے اس کا جی چاہا کہ سارا دن پی جائے۔ سگرٹ والے کی دکان سے خریدنے کے بجائے اس نے سوچا کیوں نہ کریم سے ملوں، وہ تیس میں دے دے گا۔ چنانچہ وہ اس کے ہوٹل میں پہنچا۔ اتفاق سے کریم مل گیا۔ اس نے ملتے ہی بہت ہولے سے کہا،" نذیر صاحب، شکنتلا کی بڑی بہن آئی ہوئی ہے۔ آج صبح ہی گاڑی سے پہنچی ہے۔۔۔ بہت ہٹیلی ہے۔ مگر آپ اس کو ضرور راضی کرلیں گے۔"
نذیر کچھ سوچ نہ سکا۔ اس نے اپنے دل میں اتنا کہا،" چلو دیکھ لیتے ہیں۔" لیکن اس نے کریم سے کہا،" تم پہلے یا روسکی لے آؤ۔" یہ کہہ کر اس نے تیس روپے جیب سے نکال کر کریم کو دیے۔ کریم نے نوٹ لے کر نذیر سے کہا،" میں لے آتا ہوں۔ آپ اندر کمرے میں بیٹھے۔" نذیر کے پاس صرف دس روپے تھے، لیکن وہ کمرے کا دروازہ کھلوا کر بیٹھ گیا۔ اس نے سوچا تھا کہ وسکی کی بوتل لے کر ایک نظر شکنتلا کی بہن کو دیکھ کر چل دے گا۔ جاتے وقت دو روپے کریم کو دے دے گا۔

تین طرف سے کھلے ہوئے ہوادار کمرے میں نہایت ہی میلی کرسی پر بیٹھ کر اس نے سگریٹ سلگایا اور اپنی ٹانگیں رکھ دیں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد آہٹ ہوئی۔ کریم داخل ہوا۔ اس نے

نذیر کے کان کے ساتھ منہ لگا کر ہولے سے کہا ’’نذیر صاحب آ رہی ہے ۔لیکن آپ ہی رام کیجیے گا اسے ۔‘‘

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ پانچ منٹ کے بعد ایک لڑکی جس کی شکل وصورت قریب قریب شکنتلا سے ملتی تھی ۔تیوری چڑھائے، شکنتلا کے سے انداز میں سفید دھوتی پہنے کمرے میں داخل ہوئی ۔ بڑی بے پروائی سے اس نے ماتھے کے قریب ہاتھ لے جا کر ’’آداب‘‘ کہا اور لوہے کے پلنگ پر بیٹھ گئی ۔نذیر نے یوں محسوس کیا کہ وہ اس سے لڑنے آئی ہے ۔ چھ برس پیچھے کے زمانے میں ڈبکی لگا کر وہ اس سے مخاطب ہوا ’’آپ شکنتلا کی بہن ہیں؟‘‘

اس نے بڑے تیکھے اور خفگی آمیز لہجے میں کہا ’’جی ہاں ۔‘‘ نذیر تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوگیا۔اس کے بعد اس لڑکی کو جس کی عمر شکنتلا سے غالباً تین برس بڑی تھی ۔ بڑے غور سے دیکھا۔نذیر کی یہ حرکت اس کو بہت ناگوار محسوس ہوئی ۔وہ بڑے زور سے ٹانگ ہلا کر اس سے مخاطب ہوئی ’’آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟‘‘

نذیر کے ہونٹوں پر چھ برس پیچھے کی مسکراہٹ نمودار ہوئی ’’جناب آپ اس قدر ناراض کیوں ہیں؟‘‘ وہ برس پڑی ’’میں ناراض کیوں نہ ہوں ۔۔۔ یہ آپ کا کریم میری بہن کو جے پور سے اڑا لایا ہے ۔بتائیے آپ، میرا خون نہیں کھولے گا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کو بھی وہ پیش کی گئی تھی؟‘‘

نذیر کی زندگی میں ایسا معاملہ کبھی نہیں آیا تھا۔ کچھ دیر سوچ کر اس نے اس لڑکی سے بڑے خلوص کے ساتھ کہا ’’شکنتلا کو دیکھتے ہی میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ یہ لڑکی میرے کام کی نہیں ۔ بہت الھڑ ہے، مجھے ایسی لڑکیاں بالکل پسند نہیں ۔آپ شاید برا مانیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں

ان عورتوں کو بہت زیادہ پسند کرتا ہوں جو مرد کی ضروریات کو سمجھتی ہوں۔''
اس نے کچھ نہ کہا۔نذیر نے اس سے دریافت کیا''آپ کا نام؟''

شکنتلا کی بہن نے مختصراً کہا''شاردا۔''
نذیر نے پھر اس سے پوچھا''آپ کا وطن؟''

''جے پور۔''اس کا لہجہ بہت تیکھا اور خفگی آلود تھا۔
نذیر نے مسکرا کر اس سے کہا''دیکھیے آپ کو مجھ سے ناراض ہونے کا کوئی حق نہیں۔۔۔کریم نے اگر کوئی زیادتی کی ہے تو آپ اس کو سزا دے سکتی ہیں،لیکن میرا کوئی قصور نہیں۔''یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اس کو اچانک اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر اس کے ہونٹوں کو چوم لیا۔وہ کچھ کہنے بھی نہ پائی تھی کہ نذیر اس سے مخاطب ہوا''یہ قصور البتہ میرا ہے۔اس کی سزا میں بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔''

لڑکی کے ماتھے پر بے شمار تبدیلیاں نمودار ہوئیں۔اس نے تین چار مرتبہ زمین پر تھوکا۔غالباً گالیاں دینے والی تھی،لیکن چپ ہوگئی۔اٹھ کھڑی ہوئی تھی لیکن فوراً ہی بیٹھ گئی۔نذیر نے چاہا کہ وہ کچھ کہے''بتائیے،آپ مجھے کیا سزا دینا چاہتی ہیں۔''وہ کچھ کہنے والی تھی کہ ڈربے سے کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔لڑکی اٹھی،نذیر نے اسے روکا''کہاں جا رہی ہیں آپ؟''وہ ایک دم ماں بن گئی''منی رو رہی ہے،دودھ کے لیے۔''یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔
نذیر نے اس کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی مگر کچھ سوچ نہ سکا۔اتنے میں کریم وسکی کی بوتل اور سوڈے لے کر آ گیا۔اس نے نذیر کے لیے سوڈا ڈالا۔اپنا گلاس ختم کیا اور نذیر سے

رازدارانہ لہجے میں کہا،'' کچھ باتیں ہوئیں شاردا سے؟''
''میں نے تو سمجھا تھا کہ آپ نے پٹا لیا ہوگا؟''
نذیر نے مسکرا کر جواب دیا،''بڑی غصیلی عورت ہے!''

''جی ہاں۔۔۔صبح آئی ہے، میری جان کھا گئی۔آپ ذرا اس کو رام کریں۔۔۔شکنتلا خود یہاں آئی تھی۔اس لیے کہ اس کا باپ اس کی ماں کو چھوڑ چکا ہے اور اس شاردا کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔اس کا پتی شادی کے فوراً بعد ہی اس کو چھوڑ کر خدا معلوم کہاں چلا گیا تھا۔۔۔اب اکیلی اپنی بچی کے ساتھ ماں کے پاس رہتی ہے۔۔۔آپ منا لیجئے نا اس کو؟''
نذیر نے اس سے کہا،''منانے کی کیا بات ہے؟''

کریم نے اس کو آنکھ ماری،''سالی مجھ سے تو مانتی نہیں۔جب سے آئی ہے ڈانٹ رہی ہے۔''
اتنے میں شاردا اپنی ایک سال کی بچی کو گود میں اٹھائے اندر کمرے میں آئی۔کریم کو اس نے غصے سے دیکھا۔اس نے آدھا پیگ پیا اور باہر چلا گیا۔

منی کو بہت زکام تھا۔ناک بہت بری طرح بہہ رہی تھی۔نذیر نے کریم کو بلایا اور اس کو پانچ کا نوٹ دے کر کہا،''جاؤ، ایک وکس کی بوتل لے آؤ۔'' کریم نے پوچھا،''وہ کیا ہوتی ہے؟'' نذیر نے اس سے کہا،''زکام کی دوا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک پرزے پر اس دوا کا نام لکھ دیا، ''کسی بھی اسٹور سے مل جائے گی۔''
''جی اچھا۔'' کہہ کر کریم چلا گیا۔نذیر منی کی طرف متوجہ ہوا۔اس کو بچے بہت اچھے لگتے تھے۔منی

خوش شکل نہیں تھی لیکن کم سنی کے باعث نذیر کے لیے دلکش تھی۔اس نے اس کو گود میں لیا۔ ماں سے سو نہیں رہی تھی۔سر میں ہولے ہولے انگلیاں پھیر کر اس کو سلا دیا اور شاردا سے کہا، ''اس کی ماں تو میں ہوں۔''

شاردا مسکرائی،''لائیے، میں اس کو اندر چھوڑ آؤں۔''
شاردا اس کو اندر لے گئی اور چند منٹ کے بعد واپس آ گئی۔اب اس کے چہرے پر غصے کے آثار نہیں تھے۔نذیر اس کے پاس بیٹھ گیا۔تھوڑی دیر وہ خاموش رہا۔اس کے بعد اس نے شاردا سے پوچھا،''کیا آپ مجھے اپنا پتی بننے کی اجازت دے سکتی ہیں؟''اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔شاردا نے غصے کا اظہار نہ کیا،''جواب دیجیے جناب۔''

شاردا خاموش رہی۔نذیر نے اٹھ کر ایک پیگ پیا،تو شاردا نے ناک سکوڑ کر اس سے کہا،''مجھے اس چیز سے نفرت ہے۔''نذیر نے ایک پیگ گلاس میں ڈالا۔اس میں سوڈا حل کر کے اٹھایا اور شاردا کے پاس بیٹھ گیا،''آپ کو اس سے نفرت ہے۔۔۔کیوں؟''شاردا نے مختصر سا جواب دیا،''بس ہے۔''
''تو آج سے نہیں رہے گی۔۔۔یہ لیجیے۔''یہ کہہ کر اس نے گلاس شاردا کی طرف بڑھا دیا۔

''میں ہرگز نہیں پیوں گی۔''
''میں کہتا ہوں،تم ہرگز انکار نہیں کرو گی۔''

شاردا نے گلاس پکڑ لیا۔تھوڑی دیر تک اس کو عجیب نگاہوں سے دیکھتی رہی، پھر نذیر کی طرف

مظلومانہ نگاہوں سے دیکھا۔اور ناک انگلیوں سے بند کر کے سارا گلاس غٹا غٹ پی گئی۔قے آنے کو تھی مگر اس نے روک لی۔دھوتی کے پلو سے اپنے آنسو پونچھ کے اس نے نذیر سے کہا،"یہ پہلی اور آخری بار ہے۔"

"لیکن میں نے کیوں پی؟" نذیر نے اس کے گیلے ہونٹ چومے اور کہا،"یہ مت پوچھو۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔شام کو سات بجے اس نے دروازہ کھولا۔کریم آیا تو شاردا نظریں جھکائے باہر چلی گئی۔کریم بہت خوش تھا۔اس نے نذیر سے کہا،"آپ نے کمال کر دیا۔۔۔آپ سے سو تو نہیں مانگتا،پچاس دے دیجیے۔"

نذیر شاردا سے بے حد مطمئن تھا۔اس قدر مطمئن کہ وہ گزشتہ تمام عورتوں کو بھول چکا تھا۔وہ اس کے جنسی سوالات کا سو فی صدی صحیح جواب تھی۔اس نے کریم سے کہا،"میں کل ادا کر دوں گا۔۔۔ہوٹل کا کرایہ بھی کل چکاؤں گا۔آج میرے پاس وسکی منگانے کے بعد صرف دس روپے باقی تھے۔"

کریم نے کہا،"کوئی واندہ نہیں ہے۔۔۔میں تو اس بات سے بہت خوش ہوں کہ آپ نے شاردا سے معاملے طے کر لیا۔۔۔حضور،میری جان کھا گئی تھی۔اب شکنتلا سے وہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔" کریم چلا گیا۔شاردا آئی۔اس کی گود میں منی تھی۔نذیر نے اس کو پانچ روپے دیے لیکن شاردا نے انکار کر دیا۔اس پر نذیر نے اس سے مسکرا کر کہا،"میں اس کا باپ ہوں۔تم یہ کیا کر رہی ہو۔"

شاردا نے روپے لے لیے۔بڑی خاموشی کے ساتھ۔شروع شروع میں وہ بہت باتونی معلوم ہوتی تھی۔ایسا لگتا تھا کہ باتوں کے دریا بہا دے گی۔مگر اب وہ بات کرنے سے گریز

کرتی تھی۔ نذیر نے اس کی بچی کو گود میں لے کر پیار کیا اور جاتے وقت شاردا سے کہا،''لو بھئی شاردا، میں چلا۔کل نہیں تو پرسوں ضرور آؤں گا۔''

لیکن نذیر دوسرے روز ہی آ گیا۔شاردا کے جسمانی خلوص نے اس پر جادو سا کر دیا تھا۔اس نے کریم کو پچھلے روپے ادا کیے۔ایک بوتل منگوائی اور شاردا کے ساتھ بیٹھ گیا۔اس کو پینے کے لیے کہا تو وہ بولی،''میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ پہلا اور آخری گلاس تھا۔''

نذیر اکیلا پیتا رہا۔صبح گیارہ بجے سے وہ شام کے سات بجے تک ہوٹل کے اس کمرے میں شاردا کے ساتھ رہا۔۔۔جب گھر لوٹا تو وہ بے حد مطمئن تھا، پہلے روز سے بھی زیادہ مطمئن۔شاردا اپنی واجبی شکل وصورت اور کم گوئی کے باوجود اس کے شہوانی حواس پر چھا گئی تھی۔نذیر بار بار سوچتا تھا،''یہ کیسی عورت ہے۔۔۔میں نے اپنی زندگی میں ایسی خاموش، مگر جسمانی طور پر ایسی پُرگو عورت نہیں دیکھی۔''

نذیر نے ہر دوسرے دن شاردا کے پاس جانا شروع کر دیا۔اس کو روپے پیسے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔نذیر ساٹھ روپے کریم کو دیتا تھا۔دس روپے ہوٹل والا لے جاتا تھا۔باقی پچاس میں سے قریباً تیرہ روپے کریم اپنی کمیشن کے وضع کر لیتا تھا مگر شاردا نے اس کے متعلق نذیر سے کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔

دو مہینے گزر گئے۔نذیر کے بجٹ نے جواب دے دیا۔اس کے علاوہ اس نے بڑی شدت سے محسوس کیا کہ شاردا اس کی ازدواجی زندگی میں بہت بری طرح حائل ہو رہی ہے۔وہ بیوی کے ساتھ سوتا ہے تو اس کو ایک کمی محسوس ہوتی ہے۔وہ چاہتا کہ اس کے بجائے شاردا ہو۔یہ بہت بری بات تھی۔نذیر کو چونکہ اس کا احساس تھا اس لیے اس نے کوشش کی کہ شاردا کا

سلسلہ کسی نہ کسی طرح ختم ہو جائے۔ چنانچہ اس نے شاردا ہی سے کہا،''شاردا میں شادی شدہ آدمی ہوں۔ میری جتنی جمع پونجی تھی، ختم ہوگئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا، میں کیا کروں۔ تمہیں چھوڑ بھی نہیں سکتا، حالانکہ میں چاہتا ہوں کہ ادھر کا کبھی رخ نہ کروں۔''

شاردا نے یہ سنا تو خاموش ہوگئی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد کہا،''جتنے روپے میرے پاس ہیں آپ لے سکتے ہیں۔ صرف مجھے جے پور کا کرایہ دے دیجیے تاکہ میں شکنتلا کو لے کر واپس چلی جاؤں۔''

نذیر نے اس کا پیار لیا اور کہا،'' بکواس نہ کرو۔۔۔۔۔۔تم میرا مطلب نہیں سمجھیں۔ بات یہ ہے کہ میرا روپیہ بہت خرچ ہوگیا ہے۔ بلکہ یوں کہو کہ ختم ہوگیا ہے۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ تمہارے پاس کیسے آسکوں گا۔''

شاردا نے کوئی جواب نہ دیا۔ نذیر ایک دوست سے قرض لے کر جب دوسرے روز ہوٹل میں پہنچا تو کریم نے بتایا کہ وہ جے پور جانے کے لیے تیار بیٹھی ہے۔ نذیر نے اس کو بلایا مگر وہ نہ آئی۔ کریم کے ہاتھ اس نے بہت سے نوٹ بھجوائے اور یہ کہا،'' آپ یہ روپے لے لیجیے۔۔۔ اور مجھے اپنا ایڈریس دے دیجیے۔''

نذیر نے کریم کو اپنا ایڈریس لکھ کر دے دیا اور روپے واپس کر دیے۔ شاردا آئی۔ گود میں منی تھی۔ اس نے آداب عرض کیا، اور کہا،''میں آج شام کو جے پور جارہی ہوں۔''

نذیر نے پوچھا،''کیوں؟'' شاردا نے یہ مختصر جواب دیا،''مجھے معلوم نہیں'' اور یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ نذیر نے کریم سے کہا اسے بلا کر لائے۔ مگر وہ نہ آئی۔ نذیر چلا گیا۔ اس کو یوں محسوس ہوا کہ اس کے بدن کی حرارت چلی گئی ہے۔ اس کے سوال کا جواب چلا گیا ہے۔ وہ چلی گئی، واقعی چلی

گئی۔ کریم کو اس کا بہت افسوس تھا۔ اس نے نذیر سے شکایت کے طور پر کہا،''نذیر صاحب! آپ نے کیوں اس کو جانے دیا؟''

نذیر نے اس سے کہا،''بھائی، میں کوئی سیٹھ تو ہوں نہیں۔۔۔ ہر دوسرے روز پچاس ایک، دس ہوٹل کے، تیس بوتل، اور اوپر کا خرچ علیحدہ۔ میرا تو دیوالہ پٹ گیا۔۔۔ خدا کی قسم مقروض ہو گیا ہوں۔'' یہ سن کر کریم خاموش ہو گیا۔ نذیر نے اس سے کہا،''بھئی میں مجبور تھا، کہاں تک یہ قصہ چلاتا۔'' کریم نے کہا،''نذیر صاحب اس کو آپ سے محبت تھی۔''
نذیر کو معلوم نہیں تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ وہ فقط اتنا جانتا تھا کہ شاردا میں جسمانی خلوص ہے۔ وہ اس کے مردانہ سوالات کا بالکل صحیح جواب ہے۔ اس کے علاوہ وہ شاردا کے متعلق اور کچھ نہیں جانتا تھا، البتہ اس نے مختصر الفاظ میں اس سے یہ ضرور کہا تھا کہ اس کا خاوند عیاش تھا اور اس کو صرف اس لیے چھوڑ گیا تھا کہ دو برس تک اس کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی۔ لیکن جب وہ اس سے علیحدہ ہوا تو نو مہینے کے بعد منی پیدا ہوئی جو بالکل اپنے باپ پر ہے۔

شکنتلا کو وہ اپنے ساتھ لے گئی۔ وہ اس کا بیاہ کرنا چاہتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ شریفانہ زندگی بسر کرے۔ کریم نے نذیر کو بتایا کہ وہ اس سے بہت محبت کرتی ہے۔ کریم نے بہت کوشش کی تھی کہ شکنتلا سے پیشہ کرائے۔ کئی پسینجر آئے تھے۔ ایک رات کے دو دو سو روپے دینے کے لیے تیار تھے۔ مگر شاردا نہیں مانتی تھی، کریم سے لڑنا شروع کر دیتی تھی۔ کریم اس سے کہتا تھا،''تم کیا کر رہی ہو؟'' وہ جواب دیتی،''اگر تم بیچ میں نہ ہوتے تو میں ایسا کبھی نہ کرتی۔ نذیر صاحب کا ایک پیسہ خرچ نہ ہونے دیتی۔''
شاردا نے نذیر سے ایک بار اس کا فوٹو مانگا تھا۔ جو اس نے گھر سے لا کر اس کو دے دیا تھا۔

یہ وہ اپنے ساتھ جے پور لے گئی تھی۔اس نے نذیر سے کبھی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔۔۔جب دونوں بستر پر لیٹے ہوتے تو وہ بالکل خاموش رہتی۔نذیر اس کو بولنے پر اکساتا مگر وہ کچھ نہ کہتی۔لیکن نذیر اس کے جسمانی خلوص کا قائل تھا۔جہاں تک اس بات کا تعلق تھا، وہ اخلاص کا مجسمہ تھی۔

وہ چلی گئی، نذیر کے سینے کا بوجھ ہلکا ہوگیا۔کیونکہ اس کی گھریلو زندگی میں بہت بری طرح حائل ہوگئی تھی۔اگر وہ کچھ دیر اور رہتی تو بہت ممکن تھا کہ نذیر اپنی بیوی سے بالکل غافل ہو جاتا۔کچھ دن گزرے تو وہ اپنی اصلی حالت پر آنے لگا۔شاردا کا جسمانی لمس اس کے جسم سے آہستہ آہستہ دور ہونے لگا۔

ٹھیک پندرہ دن کے بعد جب کہ نذیر گھر میں بیٹھا دفتر کا کام کر رہا تھا، اس کی بیوی نے صبح کی ڈاک لا کر اسے دی۔سارے خط وہی کھولا کرتی تھی۔ایک خط اس نے کھولا اور دیکھ کر نذیر سے کہا،''معلوم نہیں گجراتی ہے یا ہندی۔''نذیر نے خط لے کر دیکھا۔اس کو معلوم نہ ہوسکا کہ ہندی ہے یا گجراتی۔الگ ٹرے میں رکھ دیا اور اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔تھوڑی دیر کے بعد نذیر کی بیوی نے اپنی چھوٹی بہن نعیمہ کو آواز دی۔وہ آئی تو وہ خط اٹھا کر اسے دیا،''ذرا پڑھو تو کیا لکھا ہے۔تم تو ہندی اور گجراتی پڑھ سکتی ہو۔''

نعیمہ نے خط دیکھا اور کہا،''ہندی ہے''اور یہ کہہ کر پڑھنا شروع کیا۔

''جے پور۔۔۔پرئے نذیر صاحب۔''اتنا پڑھ کر وہ رک گئی۔نذیر چونکا۔نعیمہ نے ایک سطر اور پڑھی،''آداب۔آپ تو مجھے بھول چکے ہوں گے۔مگر جب سے میں یہاں آئی ہوں، آپ کو یاد کرتی رہتی ہوں۔''نعیمہ کا رنگ سرخ ہوگیا۔اس نے کاغذ کا دوسرا رخ دیکھا،''کوئی شاردا

ہے۔‘‘

نذیر اٹھا۔ جلدی سے اس نے نعیمہ کے ہاتھ سے خط لیا اور اپنی بیوی سے کہا، ’’خدا معلوم کون ہے۔۔۔میں باہر جا رہا ہوں۔اس کو پڑھا کر اردو میں لکھوالاؤں گا۔‘‘اس نے بیوی کو کچھ کہنے کا موقعہ ہی نہ دیا اور چلا گیا۔ایک دوست کے پاس جا کر اس نے شاردا کے خط جیسے کاغذ منگوائے اور ہندی میں ویسی ہی روشنائی سے ایک خط لکھوایا۔ پہلے فقرے وہی رکھے۔ مضمون یہ تھا کہ بمبئی سنٹرل پر شارداا س سے ملی تھی۔اس کو اتنے بڑے مصور سے مل کر بہت خوشی ہوئی تھی وغیرہ وغیرہ۔

شام کو گھر آیا۔ اس نے نیا خط بیوی کو دیا اور اردو کی نقل پڑھ کر سنادی۔ بیوی نے شاردا کے متعلق اس سے دریافت کیا تو اس نے کہا، ’’عرصہ ہوا ہے میں ایک دوست کو چھوڑنے گیا تھا۔شاردا کو یہ دوست جانتا تھا۔وہاں پلیٹ فارم پر میرا تعارف ہوا۔مصوری کا اسے بھی شوق تھا۔‘‘

بات آئی گئی ہوگئی لیکن دوسرے روز شاردا کا ایک اور خط آ گیا۔اس کو بھی نذیر نے اسی طریقے سے گول کیا۔ اور فوراً شاردا کو تار دیا کہ وہ خط لکھنا بند کر دے اور اس کے نئے پتے کا انتظار کرے۔ڈاک خانے جا کر اس نے متعلقہ پوسٹ مین کو تاکید کر دی کہ جے پور کا خط وہ اپنے پاس رکھے، صبح آ کر وہ اس سے پوچھ لیا کرے گا۔تین خط اس نے اس طرح وصول کیے۔اس کے بعد شاردا اس کو اس کے دوست کے پتے سے خط بھیجنے لگی۔

شاردا بہت کم گو تھی، لیکن خط بہت لمبے لکھتی تھی۔اس نے نذیر کے سامنے کبھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اس کے خط اس اظہار سے پر ہوتے تھے۔گلے شکوے، ہجر و فراق، اس قسم

کی عام باتیں جو عشقیہ خطوں میں ہوتی ہیں۔ نذیر کو شاردا سے وہ محبت نہیں تھی جس کا ذکر افسانوں اور ناولوں میں ہوتا ہے، اس لیے اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ جواب میں کیا لکھے، اس لیے یہ کام اس کا دوست ہی کرتا تھا۔ ہندی میں جواب لکھ کر وہ نذیر کو سنا دیتا تھا اور نذیر کہہ دیتا تھا، ”ٹھیک ہے۔“

شاردا بمبئی آنے کے لیے بے قرار تھی۔ لیکن وہ کریم کے پاس نہیں ٹھہرنا چاہتی تھی۔ نذیر اس کی رہائش کا اور کہیں بندوبست نہیں کر سکتا تھا۔ کیوں کہ مکان ان دنوں ملتے ہی نہیں تھے۔ اس نے ہوٹل کا سوچا۔ مگر خیال آیا، ایسا نہ ہو کہ راز فاش ہو جائے، چنانچہ اس نے شاردا کو لکھوا دیا کہ وہ ابھی کچھ دیر انتظار کرے۔

اتنے میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گئے۔ بٹوارے سے پہلے عجیب افراتفری مچی تھی۔ اس کی بیوی نے کہا کہ وہ لاہور جانا چاہتی ہے، ”میں کچھ دیر وہاں رہوں گی اگر حالات ٹھیک ہو گئے تو واپس آجاؤں گی، ورنہ آپ بھی وہیں چلے آئیے گا۔“

نذیر نے کچھ دیر اسے روکا۔ مگر جب اس کا بھائی لاہور جانے کے لیے تیار ہوا تو وہ اور اس کی بہن اس کے ساتھ چلی گئیں اور وہ اکیلا رہ گیا۔ اس نے شاردا کو سرسری طور پر لکھا کہ وہ اب اکیلا ہے۔ جواب میں اس کا تار آیا کہ وہ آرہی ہے۔ اس تار کے مضمون کے مطابق وہ جے پور سے چل پڑی تھی۔ نذیر بہت سٹپٹایا۔ مگر اس کا جسم بہت خوش تھا۔ وہ شاردا کے جسم کا خلوص چاہتا تھا۔ وہ دن پھر سے مانگتا تھا جب وہ شاردا کے ساتھ چمٹا ہوتا تھا۔ صبح گیارہ بجے سے لے کر شام کے سات بجے تک۔ اب روپے کے خرچ کا سوال ہی نہیں تھا۔ کریم بھی نہیں تھا۔ ہوٹل بھی نہیں تھا۔ اس نے سوچا ”میں اپنے نوکر کو راز دار بنا لوں گا۔ سب ٹھیک ہو

جائے گا۔ دس پندرہ روپے اس کا منہ بند کر دیں گے۔ میری بیوی واپس آئی تو وہ اس سے کچھ نہیں کہے گا۔"

دوسرے روز وہ اسٹیشن پہنچا۔ فرنٹیئر میل آئی مگر شاردا، تلاش کے باوجود اسے نہ ملی۔ اس نے سوچا، شاید کسی وجہ سے رک گئی ہے۔ دوسرا تار بھیجے گی۔ اس سے اگلے روز وہ حسب معمول صبح کی ٹرین سے اپنے دفتر روانہ ہوا۔ وہ مہالکشمی اترتا تھا۔ گاڑی وہاں رکی تو اس نے دیکھا کہ پلیٹ فارم پر شاردا کھڑی ہے۔ اس نے زور سے پکارا،"شاردا!"

شاردا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا،"نذیر صاحب!"

"تم یہاں کہاں؟"

شاردا نے شکایتاً کہا،" آپ مجھے لینے نہ آئے تو میں یہاں آپ کے دفتر پہنچی۔ پتا چلا کہ آپ ابھی تک نہیں آئے۔ یہاں پلیٹ فارم پر اب آپ کا انتظار کر رہی تھی۔"نذیر نے کچھ دیر سوچ کر اس سے کہا،"تم یہاں ٹھہرو۔ میں دفتر سے چھٹی لے کر ابھی آتا ہوں۔"

شاردا کو بنچ پر بٹھا کر جلدی جلدی دفتر گیا۔ ایک عرضی لکھ کر وہاں چپراسی کو دے آیا اور شاردا کو اپنے گھر لے گیا۔ راستے میں دونوں نے کوئی بات نہ کی، لیکن ان کے جسم آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ ایک دوسرے کی طرف کھنچتے رہے۔

گھر پہنچ کر نذیر نے شاردا سے کہا،"تم نہا لو، میں ناشتے کا بندوبست کراتا ہوں۔"شاردا نہانے لگی۔ نذیر نے نوکر سے کہا،" کہ اس کے ایک دوست کی بیوی آئی ہے۔ جلدی ناشتہ تیار کر دے۔ اس سے یہ کہہ کر نذیر نے الماری سے بوتل نکالی۔ ایک پیگ جو دو کے برابر تھا

گلاس میں انڈیلا اور پانی میں ملا کر پی گیا۔وہ اسی ہوٹل والے ڈھنگ سے شاردا سے اختلاط چاہتا تھا۔

شاردا نہادھو کر باہر نکلی اور ناشتہ کرنے لگی۔اس نے ادھرادھر کی بے شمار باتیں کیں۔نذیر نے محسوس کیا جیسے وہ بدل گئی ہے۔وہ پہلے بہت کم گو تھی۔اکثر خاموش رہتی تھی،مگر اب وہ بات بات پر اپنی محبت کا اظہار کرتی تھی۔نذیر نے سوچا''یہ محبت کیا ہے۔۔۔اگر یہ اس کا اظہار نہ کرے تو کتنا اچھا ہے،مجھے اس کی خاموشی زیادہ پسند تھی۔اس کے ذریعے سے مجھ تک بہت سی باتیں پہنچ جاتی تھیں،مگر اب اس کو جانے کیا ہوگیا ہے۔باتیں کرتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے اپنے عشقیہ خط پڑھ کر سنارہی ہے۔''

ناشتہ ختم ہوا تو نذیر نے ایک پیگ تیار کیا اور شاردا کو پیش کیا لیکن اس نے انکار کر دیا۔نذیر نے اصرار کیا تو شاردا نے اس کو خوش کرنے کی خاطر،ناک بند کر کے وہ پیگ پی لیا۔برا سا منہ بنایا۔پانی لے کر کلی کی۔نذیر کو افسوس سا ہوا کہ شاردا نے کیوں پی۔اس کے اصرار پر بھی انکار کیا ہوتا تو زیادہ اچھا تھا۔مگر اس نے اس کے بارے میں زیادہ غور نہ کیا۔نوکر کو بہت دور ایک کام پر بھیجا۔دروازہ بند کیا اور شاردا کے ساتھ بستر پر لیٹ گیا''تم نے لکھا تھا کہ وہ دن پھر کب آئیں گے۔لو آگئے ہیں پھر وہی دن،بلکہ راتیں بھی۔ان دنوں راتیں نہیں ہوتی تھیں صرف دن ہوتے تھے۔ہوٹل کے میلے کچیلے دن،یہاں ہر چیز اجلی ہے،ہر چیز صاف ہے،ہوٹل کا کرایہ بھی نہیں،کریم بھی نہیں۔یہاں ہم اپنے مالک آپ ہیں۔

شاردا نے اپنے فراق کی باتیں شروع کر دیں۔یہ زمانہ اس نے کیسے کاٹا۔وہی کتابوں اور افسانوں والی فضول باتیں،گلے،شکوے،آہیں،راتیں تارے گن گن کر کاٹنا۔نذیر نے ایک

اور پیگ پیا اور سوچا،''کون تارے گنتا ہے۔گن کیسے سکتا ہے اتنے سارے تاروں کو۔۔۔ بالکل فضول ہے،بے ہودہ بکواس ہے۔''

یہ سوچتے ہوئے اس نے شاردا کو اپنے ساتھ لگا گیا۔بستر صاف تھا،شاردا صاف تھی،وہ خود صاف تھا،کمرے کی فضا بھی صاف تھی،لیکن کیا وجہ تھی،نذیر کے دل و دماغ پر وہ کیفیت طاری نہیں ہوتی تھی جو اس غلیظ ہوٹل میں لوہے کی چارپائی پر شاردا کی قربت میں ہوتی تھی۔
نذیر نے سوچا۔شاید اس نے کم پی ہے۔اٹھ کر اس نے ایک پیگ بنایا اور ایک ہی جرعے میں ختم کر کے شاردا کے ساتھ لیٹ گیا۔شاردا نے پھر وہی لاکھ مرتبہ کہی ہوئی باتیں شروع کر دیں۔وہی ہجر و فراق کی باتیں،وہی گلے شکوے۔نذیر اکتا گیا اور اس اکتاہٹ نے اس کے جسم کو کند کر دیا۔اس کو محسوس ہونے لگا کہ شاردا کی سان گھس کر بیکار ہو گئی ہے۔اس کے جسم کے جذبات اب وہ تیز نہیں کر سکتی لیکن وہ پھر بھی اس کے ساتھ دیر تک لیٹا رہا۔

فارغ ہوا تو اس کا جی چاہا کہ ٹیکسی پکڑے اور اپنے گھر چلا جائے،اپنی بیوی کے پاس،مگر جب اس نے سوچا کہ وہ تو اپنے گھر میں ہے،اور اس کی بیوی لاہور میں تو دل ہی دل میں بہت جھنجھلایا۔اس کو یہ خواہش ہوئی کہ اس کا گھر ہوٹل بن جائے۔وہ دس روپے کرائے کے دے۔کریم کو پچاس روپے ادا کرے اور چلا جائے۔
شاردا کے جسم کا خلوص بدستور برقرار تھا،مگر وہ فضا نہیں تھی،وہ سودے بازی نہیں تھی۔یہ سب چیزیں مل ملا کر جو ایک ماحول بناتی تھیں،وہ نہیں تھا۔نذیر اپنے گھر میں تھا،اس بستر پر تھا جس پر اس کی سادہ لوح بیوی اس کے ساتھ سوتی تھی۔یہ احساس اس کے تحت الشعور میں تھا،اسی لیے وہ سمجھ نہ سکتا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔کبھی وہ یہ سوچتا تھا کہ وسکی خراب ہے،کبھی یہ سوچتا

تھا کہ شاردا نے التفات نہیں برتا، اور کبھی یہ خیال کرتا تھا کہ وہ خاموش رہتی تو سب ٹھیک ہوتا۔ پھر وہ یہ سوچتا، اتنی دیر کے بعد ملی ہے۔ دل کی بھڑاس تو نکالنا تھی بے چاری کو۔ ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائے گی، وہی پرانی شاردا بن جائے گی۔

پندرہ دن گزر گئے، مگر نذیر کو شاردا وہ پرانی ہوٹل والی شاردا محسوس نہ ہوئی۔ اس کی بچی جے پور میں تھی۔ ہوٹل میں وہ اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ نذیر اس کے زکام کے لیے، اس کی پھنسیوں کے لیے، اس کے گلے کے لیے دوائیں منگوایا کرتا تھا۔ اب یہ چیز نہیں تھی۔ وہ بالکل اکیلی تھی۔ نذیر اس کو اور اس کی منی کو بالکل ایک سمجھتا تھا۔
ایک بار شاردا کی دودھ سے بھری ہوئی چھاتیوں پر دباؤ ڈالنے کے باعث نذیر کے بالوں بھرے سینے پر دودھ کے کئی قطرے چمٹ گئے تھے اور اس نے ایک عجیب قسم کی لذت محسوس کی تھی۔ اس نے سوچا تھا، ماں بننا کتنا اچھا ہے۔۔۔ اور یہ دودھ۔ مردوں میں یہ کتنی بڑی کمی ہے کہ وہ کھا پی کر سب ہضم کر جاتے ہیں، عورتیں کھاتی ہیں اور کھلاتی بھی ہیں۔۔۔ کسی کو پالنا۔۔۔ اپنے بچے ہی کو سہی کتنی شاندار چیز ہے۔

اب منی، شاردا کے ساتھ نہیں تھی۔ وہ نامکمل تھی۔ اس کی چھاتیاں بھی نامکمل تھیں، اب ان میں دودھ نہیں تھا۔ وہ سفید سفید آبِ حیات۔ نذیر اب اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچتا تھا تو وہ اس کو منع نہیں کرتی تھی۔ شاردا، اب وہ شاردا نہیں تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاردا وہی شاردا تھی، بلکہ اس سے کچھ زیادہ تھی۔ یعنی اتنی دیر جدا رہنے کے بعد اس کا جسمانی خلوص تیز ہو گیا تھا۔ وہ روحانی طور پر بھی نذیر کو چاہتی تھی لیکن نذیر کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاردا میں اب وہ پہلی سی کشش یا جو کچھ بھی تھا نہیں رہا۔

پندرہ دن لگا تار اس کے ساتھ گزارنے پر وہ اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔ پندرہ دن دفتر سے غیر حاضری بہت کافی تھی۔اس نے اب دفتر جانا شروع کر دیا۔صبح اٹھ کر دفتر جاتا اور شام کو لوٹتا۔ شاردا نے بالکل بیویوں کی طرح اس کی خدمت شروع کر دی۔ بازار سے اون خرید کر اس کے لیے ایک سویٹر بن دیا۔شام کو دفتر سے آتا تو اس کے لیے سوڈے منگوا کر رکھے ہوتے۔ برف،تھرموس میں ڈالی ہوتی۔صبح اٹھ کر اس کا شیو کا سامان میز پر رکھتی،پانی گرم کرا کے اس کو دیتی،وہ شیو کر چکتا تو سارا سامان صاف کر دیتی،گھر کی صفائی کراتی،خود جھاڑو دیتی،نذیر اور بھی زیادہ اکتا گیا۔

رات کو وہ اکٹھے سوتے تھے مگر اب اس نے یہ بہانہ کیا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے،اس لیے اکیلا سونا چاہتا ہے۔شاردا دوسرے پلنگ پر سونے لگی۔مگر یہ نذیر کے لیے ایک اور الجھن ہوگئی۔ وہ گہری نیند سوئی ہوتی اور وہ جاگتا رہتا اور سوچتا کہ آخر یہ سب کچھ ہے کیا۔ یہ شاردا یہاں کیوں ہے؟ کریم کے ہوٹل میں اس نے اس کے ساتھ چند دن بڑے اچھے گزارے تھے،مگر یہ اس کے ساتھ کیوں چمٹ گئی ہے۔آخر اس کا انجام کیا ہوگا۔۔محبت وغیرہ سب بکواس ہے۔ جو ایک چھوٹی سی بات تھی وہ اب نہیں رہی۔اس کو واپس جے پور جانا چاہیے۔
کچھ دنوں کے بعد اس نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ وہ گناہ کر رہا ہے۔وہ کریم کے ہوٹل میں بھی کرتا تھا۔اس نے شادی سے پہلے بھی ایسے بے شمار کیے تھے،مگر ان کا اس کو احساس ہی نہیں تھا لیکن اب اس نے بڑی شدت سے محسوس کرنا شروع کیا تھا کہ وہ اپنی بیوی سے بے وفائی کر رہا ہے،اپنی سادہ لوح بیوی سے جس کو اس نے کئی بار شاردا کے خطوں کے سلسلے میں چکمہ دیا تھا۔شاردا اب اور بھی زیادہ بے کشش ہوگئی۔وہ اس سے روکھا برتاؤ کرنے لگا،مگر

اس کے التفات میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اتنا جانتی تھی کہ آرٹسٹ لوگ موجی ہوتے ہیں، اسی لیے وہ اس سے اس کی بے التفاتی کا گلہ نہیں کرتی تھی۔

پورا ایک مہینہ ہوگیا۔ جب نذیر نے دن گنے تو اس کو بہت الجھن ہوئی، ''یہ عورت کیا پورا ایک مہینہ یہاں رہی ہے۔۔۔ میں کس قدر ذلیل آدمی ہوں۔۔۔ اور ادھر ہر روز میں اپنی بیوی کو خط لکھتا ہوں، جیسے بڑا وفادار شوہر ہوں۔۔۔ جیسے مجھے اس کا بہت خیال ہے۔ جیسے اس کے بغیر میری زندگی اجیرن ہے۔ میں کتنا بڑا افراڈ ہوں۔ ادھر اپنی بیوی سے غداری کر رہا ہوں، ادھر شاردا سے۔ میں کیوں اس سے صاف صاف نہیں کہہ دیتا کہ بھئی اب مجھے تم سے لگاؤ نہیں رہا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مجھے لگاؤ نہیں رہا، یا شاردا میں وہ پہلی سی بات نہیں رہی؟''
وہ اس کے متعلق سوچتا مگر اسے کوئی جواب نہ ملتا۔ اس کے ذہن میں عجیب افراتفری پھیلی تھی۔ وہ اب اخلاقیات کے متعلق سوچتا تھا۔ بیوی سے جو وہ غداری کر رہا تھا، اس کا احساس ہر وقت اس پر غالب رہتا تھا۔ کچھ دن اور گزرے تو یہ احساس اور بھی زیادہ شدید ہوگیا۔ اور نذیر کو خود سے نفرت ہونے لگی، ''میں بہت ذلیل ہوں۔ یہ عورت میری دوسری بیوی کیوں بن گئی ہے۔ مجھے اس کی کب ضرورت تھی۔ یہ کیوں میرے ساتھ چپک گئی ہے۔ میں نے کیوں اس کو یہاں آنے کی اجازت دی، جب اس نے تار بھیجا تھا۔ لیکن وہ تار ایسے وقت پر ملا تھا کہ میں اس کو روک ہی نہیں سکتا تھا۔''

پھر وہ سوچتا کہ شاردا جو کچھ کرتی ہے، بناوٹ ہے۔ وہ اس کو اس بناوٹ سے اپنی بیوی سے جدا کرنا چاہتی ہے۔ اس سے اس کی نظروں میں شاردا اور بھی گر گئی۔ اس سے نذیر کا سلوک اور زیادہ روکھا ہوگیا۔ اس روکھے پن کو دیکھ کر شاردا بہت زیادہ ملائم ہوگئی۔ اس نے نذیر کے

آرام و آسائش کا زیادہ خیال رکھنا شروع کر دیا۔لیکن نذیر کو اس کے اس رویے سے بہت الجھن ہوئی۔وہ اس سے بے حد نفرت کرنے لگا۔

ایک دن اس کی جیب خالی تھی۔ بینک سے روپے نکلوانے اس کو یاد نہیں رہے تھے۔ دفتر بہت دیر سے گیا، اس لیے کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔جاتے وقت شاردا نے اس سے کچھ کہا تو وہ اس پر برس پڑا، ''بکواس نہ کرو۔ میں ٹھیک ہوں۔ بینک سے روپے نکلوانے بھول گیا ہوں اور سگریٹ میرے سارے ختم ہیں۔''

دفتر کے پاس کی دکان سے اس کو گولڈ فلیک کا ڈبہ ملا۔ یہ سگریٹ اس کو ناپسند تھے مگر ادھار مل گئے تھے۔اس لیے دو تین مجبوراً پینے پڑے۔شام کو گھر آیا تو دیکھا تپائی پر اس کا من بھاتا سگریٹ کا ڈبہ پڑا ہے۔خیال کیا کہ خالی ہے۔ پھر سوچا شاید ایک دو اس میں پڑے ہوں۔ کھول کر دیکھا تو بھرا ہوا تھا۔شاردا سے پوچھا ''یہ ڈبہ کہاں سے آیا؟''

شاردا نے مسکرا کر جواب دیا، ''اندر الماری میں پڑا تھا۔''

نذیر نے کچھ نہ کہا۔اس نے سوچا، شاید میں نے کھول کر اندر الماری میں رکھ دیا تھا اور بھول گیا۔لیکن دوسرے دن پھر تپائی پر سالم ڈبہ موجود تھا۔نذیر نے جب شاردا سے اس کی بابت پوچھا تو اس نے مسکرا کر وہی جواب دیا، اندر الماری میں پڑا تھا۔''

نذیر نے بڑے غصے کے ساتھ کہا، ''شاردا، تم بکواس کرتی ہو۔تمہاری یہ حرکت مجھے پسند نہیں۔ میں اپنی چیزیں خود خرید سکتا ہوں۔میں بھکاری نہیں ہوں جو تم میرے لیے ہر روز سگریٹ خریدا کرو۔'' شاردا نے بڑے پیار سے کہا، ''آپ بھول جاتے ہیں، اسی لیے میں نے دو مرتبہ گستاخی کی۔'' نذیر نے بے وجہ اور زیادہ غصے سے کہا، ''میرا دماغ خراب ہے۔۔۔لیکن مجھے یہ

گستاخی ہرگز پسند نہیں۔'' شاردا کا لہجہ بہت ہی ملائم ہو گیا'' میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔''
نذیر نے ایک لحظے کے لیے خیال کیا کہ شاردا کی کوئی غلطی نہیں۔ اسے آگے بڑھ کر اس کا منہ چوم لینا چاہیے اس لیے کہ وہ اس کا اتنا خیال رکھتی تھی۔ مگر فوراً ہی اس کو اپنی بیوی کا خیال آیا کہ وہ غداری کر رہا تھا، چنانچہ اس نے شاردا سے بڑے نفرت بھرے لہجے میں کہا'' بکواس نہ کرو۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں کل یہاں سے روانہ کر دوں۔ کل صبح تمہیں جتنے روپئے درکار ہوں گے، دے دوں گا۔'' لیکن یہ کہہ کر نذیر نے محسوس کیا جیسے وہ بڑا کمینہ اور رذیل ہے۔
شاردا نے کچھ نہ کہا'' رات کو وہ نذیر کے ساتھ سوئی۔ ساری رات اس سے پیار کرتی رہی۔ نذیر کو اس سے الجھن ہوتی رہی مگر اس نے شاردا پر اس کا اظہار نہ کیا۔ صبح اٹھا تو ناشتے پر بے شمار لذیذ چیزیں تھی۔ پھر بھی اس نے شاردا سے کوئی بات نہ کی۔ فارغ ہو کر وہ سیدھا بنک گیا۔ جانے سے پہلے اس نے شاردا سے صرف اتنا کہا'' میں بنک جا رہا ہوں۔ ابھی واپس آتا ہوں۔''
بنک کی وہ شاخ جس میں نذیر کا روپیہ جمع تھا بالکل نزدیک تھا۔ وہ دو سو روپے نکلوا کر فوراً ہی واپس آ گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ سب روپیہ شاردا کے حوالے کر دے گا اور اس کو ٹکٹ وغیرہ لے کر رخصت کر دے گا۔ مگر وہ جب گھر پہنچا تو اس کے نوکر نے بتایا کہ وہ چلی گئی ہے۔ اس نے پوچھا'' کہاں؟''
نوکر نے بتایا'' جی مجھ سے انھوں نے کچھ نہیں کہا۔۔ اپنا ٹرنک اور بستر ساتھ لے گئی ہیں۔''
نذیر اندر کمرے میں آیا تو اس نے دیکھا کہ تپائی پر اس کے پسندیدہ سگرٹوں کا ڈبہ پڑا ہے۔ بھرا ہوا۔

❁❁❁

شاداں

خان بہادر محمد اسلم خان کے گھر میں خوشیاں کھیلتی تھیں۔۔۔اور صحیح معنوں میں کھیلتی تھیں۔ان کی دو لڑکیاں تھیں، ایک لڑکا۔اگر بڑی لڑکی کی عمر تیرہ برس کی ہوگی تو چھوٹی کی یہی گیارہ ساڑھے گیارہ۔اور جو لڑکا تھا،گو سب سے چھوٹا مگر قد کاٹھ کے لحاظ سے وہ اپنی بڑی بہنوں کے برابر معلوم ہوتا تھا۔

تینوں کی عمر، جیسا کہ ظاہر ہے،اس دور سے گزر رہی تھی، جب کہ ہر آس پاس کی چیز کھلونا معلوم ہوتی ہے۔حادثے بھی یوں آتے ہیں، جیسے ربڑ کے اڑتے ہوئے غبارے، ان سے بھی کھیلنے کو جی چاہتا ہے۔

خان بہادر محمد اسلم خاں کا گھر خوشیوں کا گھر تھا۔۔۔اس میں سب سے بڑی تین خوشیاں،اس کی اولاد تھیں۔فریدہ،سعیدہ اور نجیب۔ یہ تینوں اسکول جاتے تھے جیسے کھیل کے میدان میں جاتے ہیں۔ہنسی خوشی جاتے تھے،ہنسی خوشی واپس آتے تھے اور امتحان یوں پاس کرتے تھے جیسے کھیل میں کوئی ایک دوسرے سے بازی لے جائے۔کبھی فریدہ فرسٹ آتی تھی،کبھی نجیب اور کبھی سعیدہ۔

خان بہادر محمد اسلم خاں بچوں سے مطمئن، ریٹائرڈ زندگی بسر کر رہے تھے۔انھوں نے محکمہ زراعت میں بتیس برس نوکری کی تھی۔معمولی عہدہ سے بڑھتے بڑھتے وہ بلند ترین مقام پر پہنچ گئے۔اس دوران میں انھوں نے بڑی محنت کی تھی،دن رات دفتری کام کیے تھے۔۔۔اب وہ سستا رہے تھے۔اپنے کمرے میں کتابیں لے کر پڑے رہتے اور ان کے مطالعے میں

مصروف رہتے۔ فریدہ، سعیدہ اور نجیب کبھی کبھی ماں کا کوئی پیغام لے کر آتے تو وہ اس کا جواب بھجوا دیتے۔

ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے اپنا بستر وہیں اپنے کمرے میں لگوا لیا تھا۔ دن کی طرح ان کی رات بھی یہیں گزرتی تھی۔۔۔ دنیا کے جھگڑے ٹنٹوں سے بالکل الگ۔ کبھی کبھی ان کی بیوی جو ادھیڑ عمر کی عورت تھی ان کے پاس آجاتی اور چاہتی کہ وہ اس سے دو گھڑی باتیں کریں مگر وہ جلد ہی اسے کسی بہانے سے ٹال دیتے۔ یہ بہانہ عام طور پر فریدہ اور سعیدہ کے جہیز کے متعلق ہوتا'' جاؤ، یہ عمر چونچلے بگھارنے کی نہیں۔۔۔ گھر میں دو جوان بیٹیاں ہیں، ان کے دان دہیج کی فکر کرو۔۔۔ سونا دن بدن مہنگا ہو رہا ہے۔ دس بیس تولے خرید کر کیوں نہیں رکھ لیتیں۔۔۔ وقت آئے گا تو پھر چیخو گی کہ ہائے اللہ، خالی زیوروں پر اتنا روپیہ اٹھ رہا ہے۔''
یا پھر وہ کبھی اس سے یہ کہتے، ''فرخندہ خانم۔۔۔ میری جان! ہم بڈھے ہو چکے ہیں۔۔۔ تمہیں اب میری فکر اور مجھے تمہاری فکر ایک بچے کی طرح کرنی چاہیے۔۔۔ میری ساری پگڑیاں لیر لیر ہو چکی ہیں مگر تمہیں اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ ململ کے دو تھان ہی منگوا لو۔۔۔ دو نہیں چار۔۔۔ تمہارے اور بچیوں کے دوپٹے بھی بن جائیں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا چاہتی ہو۔۔۔؟ اور ہاں وہ میری مسواکیں ختم ہو گئی ہیں۔''

فرخندہ، خان بہادر کے پلنگ پر بیٹھ جاتی اور بڑے پیار سے کہتی ''ساری دنیا برش استعمال کرتی ہے۔ آپ ابھی تک پرانی لکیر کے فقیر بنے ہیں۔'' خان بہادر کے لہجے میں نرمی آجاتی، ''نہیں فرخندہ جان۔۔۔ یہ برش اور ٹوتھ پیسٹ سب واہیات چیزیں ہیں۔'' فرخندہ کے ادھیڑ چہرے پر لکیروں کی کوڑیاں اور مولیاں سی بکھر جاتیں۔۔۔ مگر صرف ایک لحظے کے لیے خان

بہادر اس کی طرف دیکھتے اور باہر صحن میں بچوں کے کھیل کود کا شور وغل سنتے ہوئے کہتے، ''فرخندہ۔۔۔تو کل ململ کے تھان آجائیں۔۔۔اور لٹھے کے بھی۔'' لیکن فوراً ہی معلوم نہیں کیوں ان کے بدن پر جھرجھری سی دوڑ جاتی اور وہ فرخندہ کو منع کر دیتے۔''نہیں نہیں، لٹھا منگوانے کی ابھی ضرورت نہیں۔۔۔!''

باہر صحن میں بچے کھیل کود میں مصروف ہوتے۔سہ پہر کو شاداں عموماً ان کے ساتھ ہوتی۔ یہ گو نئی نئی آئی تھی لیکن ان میں فوراً ہی گھل مل گئی تھی۔سعیدہ اور فریدہ تو اس کے انتظار میں رہتی تھیں کہ وہ کب آئے اور سب مل کر ''لکن میٹی'' یا ''کھدو'' کھیلیں۔شاداں کے ماں باپ عیسائی تھے۔مگر جب سے شاداں خان بہادر کے گھر میں داخل ہوئی تھی تو فریدہ کی ماں نے اس کا اصلی نام بدل کر شاداں رکھ دیا تھا۔اس لیے کہ وہ بڑی ہنس مکھ لڑکی تھی اور اس کی بچیاں اس سے پیار کرنے لگی تھیں۔شاداں صبح سویرے آتی تو فریدہ، سعیدہ اور نجیب اسکول جانے کی تیاریوں میں مصروف ہوتے۔ وہ اس سے باتیں کرنا چاہتے مگر ماں ان سے کہتی، ''بچو جلدی کرو۔۔۔اسکول کا وقت ہو رہا ہے۔'' اور بچے جلدی جلدی تیاری سے فارغ ہو کر شاداں کو سلام کہتے ہوئے اسکول چلے جاتے۔

سہ پہر کے قریب شاداں جلدی جلدی محلے کے دوسرے کاموں سے فارغ ہو کر آجاتی اور فریدہ، سعیدہ اور نجیب کھیل میں مشغول ہو جاتے اور اتنا شور مچتا کہ بعض اوقات خان بہادر کو اپنے کمرے سے نوکر کے ذریعے سے کہلوانا پڑتا کہ شور ذرا کم کیا جائے۔۔۔یہ حکم سن کر شاداں سہم کر الگ ہو جاتی، مگر سعیدہ اور فریدہ اس سے کہتیں، ''کوئی بات نہیں شاداں۔۔۔ہم اس سے بھی زیادہ شور مچائیں تو وہ اب کچھ نہیں کہیں گے۔ایک سے زیادہ بار وہ کوئی بات نہیں کہا

کرتے۔"
اور کھیل پھر شروع ہوجاتا۔کبھی لکن میٹی ،کبھی کھدواور کبھی لوڈو۔لوڈو،شاداں کو بہت پسند تھی، اس لیے کہ یہ کھیل اس کے لیے نیا تھا۔ چنانچہ جب سے نجیب لوڈو لایا تھا،شاداں اسی کھیل پر مصر ہوتی۔مگر فریدہ،سعیدہ اور نجیب تینوں کو یہ پسند نہیں تھا،اس لیے کہ اس میں کوئی ہنگامہ برپا نہیں ہوتا۔بس وہ جو"چٹو" سا ہوتا ہے،اس میں پانسہ ہلاتے اور پھینکتے رہو اور اپنی گوٹیں آگے پیچھے کرتے رہو۔

شاداں کھلی کھلی رنگت کی درمیانے قد کی لڑکی تھی۔اس کی عمر فریدہ جتنی ہوگی مگر اس میں جوانی زیادہ نمایاں تھی۔۔۔جیسے خود جوانی نے اپنی شوخیوں پر لال پنسل کے نشان لگا دیے ہیں۔۔۔محض شرارت کے لیے۔ورنہ فریدہ اور سعیدہ میں وہ تمام رنگ، وہ تمام لکیریں، وہ تمام قوسیں موجود تھیں جو اس عمر کی لڑکیوں میں ہوتی ہیں۔لیکن فریدہ،سعیدہ اور شاداں جب پاس کھڑی ہوتیں تو شاداں کی جوانی زیرلب کچھ گنگناتی معلوم ہوتی۔
کھلی کھلی رنگت، پریشان بال اور دھڑکتا ہوا دوپٹہ جو کس کر اس نے اپنے سینے اور کمر کے اردگرد باندھا ہوتا۔ایسی ناک، جس کے نتھنے گویا ہوا میں انجانی خوشبو ڈھونڈنے کے لیے کانپ رہے ہیں۔کان ایسے جو ذرا سی آہٹ پر چونک کر سننے کے لیے تیار ہوں۔چہرے کے خدوخال میں کوئی خوبی نہیں تھی۔اگر کوئی عیب گننے لگتا تو بڑی آسانی سے گن سکتا تھا،صرف اسی صورت میں اگر اس کا چہرہ اس کے جسم سے الگ کرکے رکھ دیا جاتا۔مگر ایسا کیا جانا ناممکن تھا، اس لیے کہ اس کے چہرے اور اس کے بقایا جسم کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔جس طرح چولی علیحدہ کرنے پر جسم کے آثار اس میں باقی رہ جاتے ہیں، اسی طرح اس کے

چہرے پر بھی رہ جاتے اور اس کو پھر اس کی سالمیت ہی میں دیکھنا پڑتا۔

شاداں بے حد پھرتیلی تھی۔صبح آتی اور یوں منٹا مٹنی میں اپنا کام ختم کر کے یہ جا وہ جا۔سہ پہر کو آتی۔گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کھیل کود میں مصروف رہتی۔جب خان بہادر کی بیوی آخری بار چلا کر کہتی، ''شاداں، اب خدا کے لیے کام تو کرو۔'' تو وہ وہیں کھیل بند کر کے اپنے کام میں مشغول ہو جاتی۔ٹوکرہ اٹھاتی اور دو دو زینے ایک جست میں طے کرتی کوٹھے پر پہنچ جاتی۔وہاں سے فارغ ہو کر دھڑ دھڑ دھڑ نیچے اترتی اور صحن میں جھاڑو شروع کر دیتی۔
اس کے ہاتھ میں پھرتی اور صفائی دونوں چیزیں تھیں۔خان بہادر اور اس کی بیوی فرخندہ کو صفائی کا بہت خیال تھا،لیکن مجال ہے جو شاداں نے کبھی ان کو شکایت کا موقع دیا ہو۔یہی وجہ ہے کہ وہ اس کے کھیل کود پر معترض نہیں ہوتے تھے۔یوں بھی وہ اس کو پیار کی نظروں سے دیکھتے تھے۔روشن خیال تھے،اس لیے چھوت چھات ان کے نزدیک بالکل فضول تھی۔

شروع شروع میں تو خان بہادر کی بیوی نے اتنی اجازت دی تھی کہ لکن میٹی میں اگر کوئی شاداں کو چھوئے تو لکڑی استعمال کرے اور اگر وہ چھوئے تو بھی لکڑی کا کوئی ٹکڑا استعمال کرے،لیکن کچھ دیر کے بعد یہ شرط ہٹا دی گئی اور شاداں سے کہا گیا کہ وہ آتے ہی صابن سے اپنا ہاتھ منہ دھولیا کرے۔جب شاداں کی ماں کمانے کے لیے آتی تھی تو خان بہادر اپنے کمرے کی کسی چیز اس کو چھونے نہیں دیتے تھے،مگر شاداں کو اجازت تھی کہ وہ صفائی کے وقت چیزوں کی جھاڑ پونچھ بھی کر سکتی ہے۔
صبح سب سے پہلے شاداں، خان بہادر کے کمرے کی صفائی کرتی تھی۔وہ اخبار پڑھنے میں مشغول ہوتے۔شاداں ہاتھ میں برش لیے آتی تو ان سے کہتی ''خان بہادر صاحب۔۔۔ذرا

برآمدے میں چلے جائیے!'' خان بہادر اخبار سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھتے، شاداں فوراً ان کے پلنگ کے نیچے سے ان کے سلیپر اٹھا کر ان کو پہنا دیتی اور وہ برآمدے میں چلے جاتے۔ جب کمرے کی صفائی اور جھاڑ پونچھ ہو جاتی تو شاداں دروازے کی دہلیز کے پاس ہی سے کمر میں ذرا سا جھانکنے کا خم پیدا کر کے خان بہادر کو پکارتی،'' آجائیے خان بہادر صاحب۔'' خان بہادر صاحب اخبار اور سلیپر کھڑکھڑاتے اندر آجاتے۔۔۔ اور شاداں دوسرے کاموں میں مشغول ہو جاتی۔

شاداں کو کام پر لگے، دو مہینے ہو گئے تھے۔ یہ گزرے تو خان بہادر کی بیوی نے ایک دن یوں محسوس کیا کہ شاداں میں کچھ تبدیلی آگئی ہے۔ اس نے سرسری غور کیا تو یہی بات ذہن میں آئی کہ محلے کے کسی نوجوان سے آنکھ لڑ گئی ہو گی۔ اب وہ زیادہ بن ٹھن کے رہتی تھی۔ اگر وہ پہلے کوری ململ تھی، تو اب ایسا لگتا تھا کہ اسے کلف لگا ہوا ہے۔۔۔ مگر یہ کلف بھی کچھ ایسا تھا جو ململ کے ساتھ انگلیوں میں چنا نہیں گیا تھا۔ شاداں دن بدن تبدیل ہو رہی تھی۔ پہلے وہ اترن پہنتی تھی، پر اب اس کے بدن پر نئے جوڑے نظر آتے تھے۔۔۔ بڑے اچھے فیشن کے بڑے عمدہ سلے ہوئے۔ ایک دن جب وہ سفید لٹھے کی شلوار اور پھولوں والی جارجٹ کی قمیص پہن کر آئی تو فریدہ کو باریک کپڑے کے نیچے سفید سفید گول چیزیں نظر آئیں۔

لکن میٹی ہو رہی تھی۔ شاداں نے دیوار کے ساتھ منہ لگا کر زور سے اپنی آنکھیں میچی ہوئی تھیں۔ فریدہ نے اس کی قمیص کے نیچے سفید سفید گول چیزیں دیکھی تھیں۔ وہ بوکھلائی ہوئی تھی۔ جب شاداں نے پکارا،'' چھپ گئے؟'' تو فریدہ نے سعیدہ کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹ کر ایک کمرے میں لے گئی اور دھڑکتے ہوئے دل سے اس کے کان میں کہا،'' سعیدہ۔۔۔ تم نے دیکھا، اس

نے کیا پہنا ہوا تھا؟''

سعیدہ نے پوچھا،''کس نے؟''فریدہ نے اس کے کان ہی میں کہا،''شاداں نے؟''
''کیا پہنا ہوا تھا؟''

فریدہ کی جوابی سرگوشی سعیدہ کے کان میں غڑاپ سے غوطہ لگا گئی۔جب ابھری تو سعیدہ نے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھا اور ایک بھنچی بھنچی حیرت کی''ہیں''اس کے لبوں سے خود کو گھسیٹتی ہوئی باہر نکلی۔دونوں بہنیں کچھ دیر کھسر پھسر کرتی رہیں۔۔۔اتنے میں دھما کا سا ہوا اور شاداں نے ان کو ڈھونڈ لیا۔۔۔اس پر سعیدہ اور فریدہ کی طرف سے قاعدے کے مطابق چخم ڈھاڑ ہونا چاہیے تھی مگر وہ چپ رہیں۔شاداں کی خوشی کی مزید چیخیں اس کے حلق میں رک گئیں۔
فریدہ اور سعیدہ کمرے کے اندھیرے کونے میں کچھ سہمی سہمی کھڑی تھیں،شاداں بھی قدرے خوفزدہ ہوگئی۔ماحول کے مطابق اس نے اپنی آواز دبا کر ان سے پوچھا،''کیا بات ہے؟''
فریدہ نے سعیدہ کے کان میں کچھ کہا،سعیدہ نے فریدہ کے کان میں۔دونوں نے ایک دوسری کو کہنیوں سے ٹھوکے دیے۔آخر فریدہ نے کانپتے ہوئے لہجے میں شاداں سے کہا،''یہ تم نے۔۔۔یہ تم نے قمیص کے نیچے کیا پہن رکھا ہے؟''شاداں کے حلق سے ہنسی کے گول گول ٹکڑے نکلے۔سعیدہ نے پوچھا،''کہاں سے لی تو نے یہ؟''شاداں نے جواب دیا،''بازار سے؟''فریدہ نے بڑے اشتیاق سے پوچھا،''کتنے میں؟''

''دس روپے میں!''
دونوں بہنیں ایک دم چلاتے چلاتے رک گئیں،''اتنی مہنگی!''

شاداں نے صرف اتنا کہا، ''کیا ہم غریب دل کو اچھی لگنے والی چیزیں نہیں خرید سکتے ؟'' اس بات نے فوراً ہی ساری بات ختم کر دی ۔۔۔تھوڑی دیر خاموشی رہی اس کے بعد پھر کھیل شروع ہوگیا۔کھیل جاری تھا۔مگر کہاں جاری تھا۔ یہ خان بہادر کی بیوی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔۔اب تو شاداں بڑھیا قسم کا تیل بالوں میں لگاتی تھی۔ پہلے ننگے پاؤں ہوتی تھی، پر اب اس کے پیروں میں اس نے سینڈل دیکھے۔

کھیل یقیناً جاری تھا۔۔مگر خان بہادر کی بیوی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اگر کھیل جاری ہے تو اس کی آواز شاداں کے جسم سے کیوں نہیں آتی۔ایسے کھیل بے آواز اور بے نشان تو نہیں ہوا کرتے۔ یہ کیسا کھیل ہے جو صرف کپڑے کا گز بنا ہوا ہے۔اس نے کچھ دیر اس معاملے کے بارے میں سوچا،لیکن پھر سوچا کہ وہ کیوں بیکار مغز پاشی کرے۔ایسی لڑکیاں خراب ہوا ہی کرتی ہیں اور کتنی داستانیں ہیں جو ان کی خرابیوں سے وابستہ ہیں اور شہر کے گلی کوچوں میں ان ہی کی طرح رُلتی پھرتی ہیں۔دن گزرتے رہے اور کھیل جاری رہا۔

فریدہ کی ایک سہیلی کی شادی تھی۔اس کی ماں خان بہادر کی بیوی کی منہ بولی بہن تھی۔اس لیے سب کی شرکت لازمی تھی۔گھر میں صرف خان بہادر تھے،سردی کا موسم تھا۔رات کو خان بہادر کی بیوی کو معاً خیال آیا کہ اپنی گرم شال منگوا لے۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ نوکر بھیج دے مگر وہ ایسے صندوق میں پڑی تھی جس میں زیورات بھی تھے،اس لیے اس نے نجیب کو ساتھ لیا اور اپنے گھر آئی۔رات کے دس بجے چکے تھے۔اس کا خیال تھا کہ دروازہ بند ہوگا، چنانچہ اس نے دستک دی۔جب کسی نے نہ کھولا تو نجیب نے دروازے کو ذرا سا دھکا دیا۔وہ کھل گیا۔

اندر داخل ہو کر اس نے صندوق سے شال نکالی اور نجیب سے کہا،" جاؤ، دیکھو تمہارے ابا کیا کر رہے ہیں۔ان سے کہہ دینا کہ تم تو ابھی تھوڑی دیر کے بعد لوٹ آؤ گے،لیکن ہم سب کل صبح آئیں گے۔۔۔جاؤ بیٹا!" صندوق میں چیزیں قرینے سے رکھ کر وہ تالا لگا رہی تھی کہ نجیب واپس آیا اور کہنے لگا،" ابا جی تو اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔"

"اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔۔۔؟ اپنے کمرے میں نہیں ہیں تو کہاں ہیں؟" خان بہادر کی بیوی نے تالا بند کیا اور چابی اپنے بیگ میں ڈالی،" تم یہاں کھڑے رہو، میں ابھی آتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے شوہر کے کمرے میں گئی جو کہ خالی تھا مگر بتی جل رہی تھی۔بستر پر سے چادر غائب تھی۔فرش دھلا ہوا تھا۔۔۔ایک عجیب قسم کی بو کمرے میں بسی ہوئی تھی۔خان بہادر کی بیوی چکرا گئی کہ یہ کیا معاملہ ہے۔۔۔پلنگ کے نیچے جھک کر دیکھا،مگر وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔۔لیکن ایک چیز تھی۔اس نے رینگ کر اسے پکڑا اور باہر نکال کر دیکھا۔۔۔خان بہادر کی موٹی مسواک تھی۔۔۔ اتنے میں آہٹ ہوئی۔ خان بہادر کی بیوی نے مسواک چھپالی۔۔۔خان بہادر اندر داخل ہوئے اور ان کے ساتھ ہی مٹی کے تیل کی بو۔ان کا رنگ زرد تھا جیسے سارا لہو نچڑ چکا ہے۔

کانپتی ہوئی آواز میں خان بہادر نے اپنی بیوی سے پوچھا،" تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"
"کچھ نہیں۔۔۔شال لینے آئی تھی۔۔۔میں نے سوچا،آپ کو دیکھتی چلوں۔"

"جاؤ"

خان بہادر کی بیوی چلی گئی ۔۔۔ چند قدم صحن میں چلی ہوگی کہ اسے دروازہ بند کرنے کی آواز آئی ۔وہ بہت دیر تک اپنے کمرے میں بیٹھی رہی پھر نجیب کو لے کر چلی گئی ۔

دوسرے روز فریدہ کی سہیلی کے گھر خان بہادر کی بیوی کو یہ خبر ملی کہ خان بہادر گرفتار ہو گئے ہیں ۔۔۔ جب اس نے پتا لیا تو معلوم ہوا کہ جرم بہت سنگین ہے ۔شاداں جب گھر پہنچی تو لہولہان تھی ۔وہاں پہنچتے ہی وہ بے ہوش ہوگئی ۔اس کے ماں باپ اسے ہسپتال لے گئے ۔ پولیس ساتھ تھی ۔شاداں کو وہاں ایک لحظے کے لیے ہوش آیا اور اس نے صرف ''خان بہادر'' کہا ۔اس کے بعد وہ ایسی بے ہوش ہوئی کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سوگئی ۔

جرم بہت سنگین تھا ۔تفتیش ہوئی ۔مقدمہ چلا ۔۔۔استغاثے کے پاس کوئی عینی شہادت موجود نہیں تھی ۔ایک صرف شاداں کے لہو میں لتھڑے ہوئے کپڑے تھے اور وہ دو لفظ جو اس نے مرنے سے پہلے اپنے منہ سے ادا کیے تھے ۔۔۔لیکن اس کے باوجود اسغاثے کو پختہ یقین تھا کہ مجرم خان بہادر ہے، کیونکہ ایک گواہ ایسا تھا جس نے شاداں کو شام کے وقت خان بہادر کے گھر کی طرف جاتے دیکھا تھا ۔

صفائی کے گواہ صرف دو تھے ۔خان بہادر کی بیوی اور ایک ڈاکٹر ۔ڈاکٹر نے کہا کہ خان بہادر اس قابل ہی نہیں کہ وہ کسی عورت سے ایسا رشتہ قائم کرسکے ۔شاداں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ نابالغ تھی ۔اس کی بیوی نے اس کی تصدیق کی ۔

خان بہادر محمد اسلم خان بری ہو گئے ۔۔۔مقدمے میں انھیں بہت کوفت اٹھانی پڑی ۔ بری ہو کر جب گھر آئے تو ان کی زندگی کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا ۔ایک صرف انھوں نے مسواک کا استعمال چھوڑ دیا ۔

❁❁❁